ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ

یہ وہ کتاب ہے جس کے کلام الٰہی ہونے میں ذرہ بھی شک نہیں ہے

معجزہ قرآن مجید

یعنی

قرآن مجید کے لفظاً اور معناً کلام الٰہی اور معجزہ ہونے کا ناقابل تردید

واقعات اور دلائل سے

کامل ثبوت

اعجاز قرآن مجید کو واضح کرنیوالی اپنی قسم کی پہلی کتاب

نوشتہ

محمد یسین احمد پی ای ایس (ریٹائرڈ)

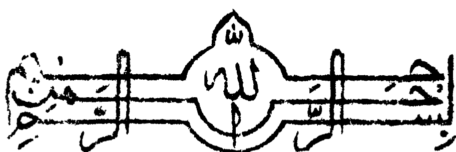
ہیڈ ماسٹر اسلامیہ ہائی اسکول بریلی

بار اول ۱۰۰۰ جلد

سنہ ۱۳۴۳ھ

مجلد عہ غیر مجلد عہ

فہرست مضامین



تمہید

بائبل جو ہندوستان کے تمام مشن اسکولوں اور کالجوں میں پڑھائی جاتی ہے اس میں عہد نامہ عتیق اور عہد نامہ جدید یعنی توریت اور انجیل دونوں شامل ہوتی ہیں۔ وہ اصل الفاظ اور وہ زبان جسمیں توریت اور انجیل نازل ہوئی تھیں مدت ہوئی کہ دنیا اُن سے محروم ہو گئی ان کتب سماوی کے قدیم قلمی نسخوں کا دنیا میں کہیں وجود باقی نہیں ہے اب صرف ان کے ترجمے مروج ہیں۔ توریت کا عبرانی زبان میں سب سے پرانا قلمی نسخہ جو اس وقت دنیا میں موجود ہے وہ نویں صدی عیسوی کا لکھا ہوا ہے۔ اور انجیل کا کوئی قلمی نسخہ چوتھی صدی عیسوی سے پیشتر کا دنیا میں موجود نہیں ہے۔

سرسید احمد خاں صاحب مرحوم نے اپنی مشہور و معروف

کتاب" خطبات احمدیہ" سر ولیم میور کی کتاب لائف آف محمدؐ کے جواب میں بہت تحقیق و تفتیش کے بعد بزمانہ قیام لندن تصنیف فرمائی تھی اس کتاب کے دسویں خطبہ میں آپ تحریر فرماتے ہیں کہ

"جب قرآن مجید میں یہ پایا گیا کہ توریت اور انجیل میں ہمارے پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر موجود ہے اور آپ کا لقب بھی مذکور ہے تو مسلمان علمائے توریت و انجیل میں اُس کی تلاش شروع کی ۔ مگر اُنھوں نے عہد عتیق اور عہد جدید کی کتابوں کو نہایت ابتر اور پریشان حالت میں پایا کیونکہ کوئی اصلی نسخہ توریت اور انجیل کا دنیا میں موجود نہ تھا ۔ اور جس قدر نقلیں موجود تھیں وہ آپس میں نہایت مختلف تھیں اور اُن کے جو ترجمے مشرقی زبانوں میں ہوئے تھے اُن میں باہم اس قدر اختلاف تھا کہ اُن کی نسبت یہ خیال ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ سب ایک ہی اصلی کتاب کے ترجمے ہیں"

توریت اور انجیل کے متعلق یہودیوں اور عیسائیوں کا مسلمانوں کی طرح یہ عقیدہ نہیں ہے کہ وہ کلام الٰہی ہیں ۔ بلکہ دونوں مذہب کے علما اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ انبیا بنی اسرائیل پر سوائے احکام عشرہ حضرت موسیٰ کے جو وحی آتی تھی اُس کے الفاظ وہ نہیں ہوتے تھے جو توریت و زبور و صحف انبیا میں لکھے ہوئے تھے بلکہ اُن کا صرف مطلب القا ہوتا تھا

پھر وہ اس کو اپنی زبان اور محاورہ میں لوگوں کے سامنے بیان کر دیا کرتے تھے
اناجیل اربعہ یعنی متی کی انجیل، مرقس کی انجیل، لوقا کی انجیل اور یوحنا
کی انجیل جو اب عیسائیوں میں مستند اور مقدس تسلیم کی جاتی ہیں اور گرجاؤں
میں پڑھی جاتی ہیں۔ ان کے متعلق کسی تحقیق و تفتیش کی ضرورت نہیں ہو آپ
اتوار کے دن کسی گرجا میں پہونچکر پادری صاحب سے انگریزی زبان میں "ہولی
بائبل" (مقدس انجیل) مانگ لیجیے۔ اور توریت کے بعد انجیل کا سرورق
ملاحظہ فرمایئے۔ اس پر آپ کو انگریزی زبان میں یہ عبارت چھپی ہوئی ملے گی

ہز مجسٹی شہنشاہ معظم کے مخصوص حکم سے ہمارے مولیٰ اور نجات دہندہ
حضرت عیسےٰ علیہ السلام کا یہ عہدنامہ جدید "اصلی" یونانی زبان سے
ترجمہ کیا گیا ہے اور پیشتر جس قدر ترجمے ہو چکے ہیں اُن سے محنت
کے ساتھ اس کا مقابلہ کر کے نظر ثانی (ترمیم) کی گئی ہے (Revised)

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ عیسائی علماء ان اناجیل اربعہ کا اصلی ماخذ
(Original) یونانی زبان کی انجیل تسلیم کرتے ہیں یعنی عبرانی زبان
کی انجیل جو حضرت عیسےٰ کی زبان میں بذریعہ روح القدس حضرت عیسےٰ
پر نازل ہوئی تھی ان عیسائیوں کے کبھی ہاتھ ہی نہیں لگی! اس وقت دنیا میں
عبرانی زبان کی انجیل کا وجود در کنار اس کا کہیں مفصل تذکرہ بھی نہیں پایا
جاتا۔ بلکہ سب عیسائی علماء بالاتفاق اصل بائبل یونانی زبان ہی میں تسلیم

کرتے چلے آئے ہیں۔ اور ان کی تذکرہ اور تاریخ کی کتابوں میں ایسا ہی لکھا ہوا ہے دوسری بات یہ ہے کہ وہ زمانہ حال کے ترجمہ کی بابت اقرار کرتے ہیں کہ پچھلے تمام ترجموں کی روشنی میں اس پر نظرثانی کی گئی ہے۔ نظرثانی (Revision) میں ترمیم اور اصلاح کا تصوّر غالب ہوتا ہے۔ لہذا صاف ظاہر ہے کہ پچھلے ترجمے باہم مختلف ہیں۔ اور مروجہ ترجمہ اُن کی اصلاح شدہ صورت ہے۔ آئی پر بس نہیں۔ اب سرورق اُلٹیے، سب سے پہلے متی کی انجیل ہے۔ اس کا عنوان ملاحظہ کیجیے۔ اس کا اُردو ترجمہ ہے۔ "انجیل بموجب" یا "حسب منشا مقدس متی" کے According to S, Mathew یہی الفاظ باقی تین انجیلوں کے عنوان میں بھی درج ہیں۔

عنوانوں کے ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ انجیلیں حضرت عیسیٰ کے اُن حواریوں نے خود نہیں لکھیں جن کے نام سے وہ منسوب ہیں ورنہ لفظ "بموجب" یا "حسب منشا" کے اضافہ کی مطلق ضرورت ہی نہ تھی۔ چار جدا جدا انجیلوں کا وجود ہی بجائے خود یہ امر تسلیم کرنے کے لیے کافی تھا کہ یہ چار شخصوں کی لکھی ہوئی ہیں۔ عنوان میں بحیثیت مصنف صرف اُن کا نام کافی ہوتا۔

بہرحال یہ واقعہ ہمارے اور عیسائیوں کے نزدیک متفق علیہ ہے کہ یہ چاروں انجیلیں نہ تو حضرت عیسیٰ پر بذریعہ وحی نازل ہوئیں۔ نہ حضرت

عیسے کی تصنیف ہیں۔ نہ اُن کے عہد میں لکھی گئیں۔ اور اس واقعہ سے بھی کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ حضرت عیسےٰ کی زبان عبرانی تھی۔ لہذا جو انجیل آپ پر نازل ہوئی اور جس کا ذکر قرآن مجید میں ہے اور جس کے مختصر حوالے اناجیل اربعہ میں بھی پائے جاتے ہیں یقیناً عبرانی زبان میں تھی جس کا کوئی نسخہ اس وقت دنیا میں موجود نہیں۔

اب ایک اور لطف کی بات یہ ہے کہ منجملہ اُن چار مقدس بزرگوں کے جن سے اناجیل اربعہ منسوب ہیں۔ صرف دو یعنی متی اور یوحنا تو حضرت عیسےٰ کے حواری تھے۔ باقی دو یعنی مرقس اور لوقا کو تو حضرت عیسےٰ کی کبھی صحبت بھی نصیب نہیں ہوئی۔ مرقس تو پطرس حواری کے شاگرد تھے اور عیسائی اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ مرقس نے حضرت مسیح کے حالات تو پطرس حواری سے معلوم کیے تھے۔ اب رہ گئے لوقا ان کے اُستاد مقدس پولُس بھی حضرت عیسےٰ کے حواری نہ تھے۔ غرض حضرت عیسےٰ کے عہد سے ایک عرصہ کے بعد لوگوں نے حضرت عیسےٰ کے حالات اور اُن کے معجزات اور پند و نصائح آپ کے حواریوں اور حواریوں کے شاگردوں سے معلوم کر کے قلمبند کر دیئے۔

اب ذرا قرآن مجید کی طرف توجہ کیجیے۔ اس کتاب اللہ نے ایک بار نہیں، دو بار نہیں بلکہ متعدد بار کمال شد و مد سے یہ دعویٰ کیا ہے کہ میں

کلامِ الٰہی ہوں۔ بے مثل ہوں۔ بے مانند ہوں۔ کسی جن و بشر کی مجال نہیں کہ میرے ایک چھوٹے سے چھوٹے ٹکڑے کی مانند بھی اپنا کلام پیش کر سکے۔ دوسری طرف ہر مسلمان کا یہ پختہ عقیدہ اور یقین ہے کہ قرآن مجید لفظاً اور معناً اوّل سے لیکر آخر تک سب اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو وقتاً فوقتاً بذریعہ وحی نبی آخر الزمان صلعم پر نازل ہوا تھا۔ اس میں ایک لفظ ایک حرف بلکہ ایک نقطہ کا بھی فرق نہیں ہے۔ نظر بہ حالاتِ دنیا میں اس سے زیادہ حیرت انگیز اور کیا واقعہ ہو سکتا ہے کہ بائبل تو تمام دنیا کی درسگاہوں میں ابتدائی درجہ سے لیکر انتہائی درجوں تک اصل پڑھائی جاتی ہے۔ مگر قرآن مجید دنیا کے کسی اسکول اور کالج اور یونیورسٹی میں بطور مذہبی ٹکسٹ بک کے نہیں پڑھایا جاتا۔ حیرت پر حیرت ایک اور یہ ہے کہ بائبل پڑھانے کے لیے دنیا کے بڑے بڑے عیسائی علما فضلا اور محققین نے اپنی زندگیاں وقف کر دی ہیں۔ ہندوستانی طلبا کو صرف بائبل کا متن پڑھانے اور سمجھانے کی غرض سے انگلستان اور امریکہ سے ہزاروں میلوں کا سفر طے کر کے بڑے بڑے نامور اور سند یافتہ پادری صاحبان ہندوستان تشریف لاتے ہیں۔ اور صرف انجیل پڑھاتے پڑھاتے اس غیر ملک میں اپنی عمریں ختم کر دیتے ہیں۔ مگر مجھے غالباً اپنی بدقسمتی سے کسی ایسے مسلمان عالم کا نام معلوم نہیں ہے جس نے صرف قرآن مجید کی تعلیم دینا اپنی زندگی کا

مقصد قرار دیا ہو۔ اور اپنی زندگی صرف قرآن مجید پڑھانے میں بسر کی ہو۔

ہندوستان میں قرآن مجید عموماً بچپن میں بغیر ترجمہ کے تبرکاً پڑھایا جاتا ہے۔ اور اس کے پڑھانے والے جس دل و دماغ اور جس پایہ و حیثیت کے لوگ ہوتے ہیں سب کو معلوم ہے۔ اور اب چونکہ تمدنی اور اقتصادی حالات کے اقتضا سے کسب معاش کی جد و جہد روز بروز مشکل ہوتی جاتی ہو اسی قدر مذہب کی گرفت قلوب پر بتدریج ڈھیلی ہوتی جارہی ہے۔ اور بچپن میں تبرکاً قرآن پڑھانے کا وہ رواج بھی رفتہ رفتہ معدوم ہوتا جارہا ہے۔

گزشتہ تیس سال میں میرا مختلف درسگاہوں سے تعلق رہا ہے کم و بیش دس سال علی گڑھ کے شہرۂ آفاق مدرسۃ العلوم (ایم اے او کالج) میں رہنے کا موقع ملا۔ اور بہ حیثیت اسسٹنٹ سکریٹری کالج کے اس نامور درسگاہ کے نظم و نسق سے گہرا تعلق رہا ہے۔ اور پچھلے بیس برس میں بہ حیثیت ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ اسکولوں اور اسلامیہ اسکولوں کے حالات کا مطالعہ کرتا رہا ہوں۔ علی گڑھ کالج کی امتیازی خصوصیت یہی سمجھی جاتی تھی کہ وہ مسلمانوں کی اپنی درسگاہ ہے۔ اور اس میں مسلمان طلبا کی مذہبی تعلیم کا بھی انتظام ہے۔ اسلامیہ اسکولوں کا بھی طرۂ امتیاز یہی دینی تعلیم کا انتظام سمجھا جاتا ہے۔

مگر طویل تجربہ کے بعد میرا یہ خیال ہے کہ پبلک اسکولوں اور کالجوں میں مسلمان طلباء کی دینی تعلیم کا کوئی اہم نصب العین مسلمانوں کے کبھی پیش نظر نہیں ہوا۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ نہ تو اس ملک کے مسلمانوں نے من حیث القوم کوئی معین دینی نصاب تعلیم مرتب کیا۔ نہ موزوں مذہبی معلموں کی تیاری اور فراہمی کی طرف کبھی توجہ کی۔

اس وقت ہندوستان کے مختلف حصوں میں جو جو دینی نصاب تعلیم مروج ہیں اُن میں سے بیشتر میرے پیش نظر ہیں۔ کسی نصب العین کی عدم موجودگی میں نصاب تعلیم میں اختلاف اور انتشار لازمی تھا۔ جو نصاب بھی دیکھئے اُن کا مشترک حصہ چند فقہی مسائل ہیں۔ اور حال میں سیرت نبوی کی طرف کچھ کچھ توجہ مبذول ہوتی جا رہی ہے۔

تعلیم کا جزو موثر معلم کی ذات ہوتی ہے۔ لہذا پبلک اسکولوں اور کالجوں میں دینی تعلیم کے مسئلہ کا حل بہت کچھ دینیات کے موزوں معلموں کی دستیابی پر منحصر ہے۔ جب سائنس۔ ریاضی۔ تاریخ۔ جغرافیہ۔ فلسفہ۔ منطق اقتصادیات اور زبانوں کی تعلیم کے واسطے جدا جدا اوصاف کے تربیت یافتہ معلموں کی ضرورت اور تلاش ہوتی ہے تو کیا مذہب ایسا گیا گزرا مضمون ہے کہ اس کے معلم کے لیے کسی وصف کی ضرورت نہیں اور ہر شخص اس کی تعلیم دینے کا اہل تسلیم کیے جانے کے قابل ہے۔

رہ گیا نصب العین اور ایک موزوں نصاب تعلیم کا مسئلہ۔ یہ علمار دین اور اکابر قوم کی سب سے زیادہ توجہ کا مستحق ہے۔

تمام اعلیٰ اور ادنیٰ عیسائی درسگاہوں میں اصل بائبل کی تعلیم ہوتے ہوئے دیکھ کر فطرتاً میرے دل میں یہ سوال پیدا ہوا کہ اسلامی درسگاہوں خصوصاً مشرقی علوم کی درسگاہوں کے نصاب تعلیم میں اصل قرآن مجید کو کیوں داخل نہیں کیا گیا۔

اس سوال کا کوئی شافی جواب مجھے اس وقت تک معلوم نہیں ہوا میرا یہ ایک المناک تجربہ ہے کہ اسکولوں کے مسلمان طلبار کو عموماً یہ تو بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ بائبل کی انگریزی نہایت فصیح اور سلیس ہے جس کو سلیس انگریزی زبان سیکھنا مقصود ہو وہ بائبل کی عبارتیں حفظ یاد کرے مگر شاذونادر ایسے طلبار دیکھنے میں آئے جن کو قرآن مجید کی امتیازی خصوصیات کا واجبی علم ہو۔ ہماری بے مثل مذہبی کتاب ہونے کی حیثیت سے ہر مسلمان کے دل میں قرآن مجید کی عظمت اور وقعت ہے مگر اس کتاب الٰہی کے اعجاز کی دلکش تفصیلات سے بہت کم مسلمان واقف ہیں۔

اس کتاب کی ترتیب سے میرا مقصد یہ ہے کہ میں قرآن مجید کے متعلق کچھ ایسے معلومات طلبار کے سامنے پیش کروں جو غالباً اس تفصیل

کے ساتھ اُن کے پیش نظر نہیں ہیں جب وہ واقف ہوں گے کہ اُن کی مقدس کتاب کیسے کیسے حیرت انگیز عجائبات اور نادر کمالات پر مشتمل ہے تو وہ فطرتاً اُس کی حقیقی شان سے متاثر ہوں گے۔ اور کم سے کم اُن کے دلوں میں اس کتاب کا حقیقی وقار پیدا ہوگا۔ میں نے اس کتاب میں اپنی طرف سے کوئی نئی بات نہیں لکھی۔ بلکہ صرف اپنے علمائے کرام اور بعض مسلمان اور یورپین محققین کی تصانیف سے خوشہ چینی کی ہے۔ مثلاً مولانا سیلمان صاحب ندوی کی سیرت نبوی جلد سوم۔ شمس العلما ڈاکٹر نذیر احمد صاحب مرحوم اور مولانا اشرف علی صاحب کا ترجمہ قرآن مجید۔ سر سید احمد خاں صاحب مرحوم کی کتاب خطبات احمدیہ۔ خلیفہ سید محمد حسن خاں صاحب مرحوم کی اعجاز التنزیل۔ مولانا محمد علی صاحب۔ ایم۔ اے لاہوری کا ترجمہ قرآن مجید۔ مولانا عبدالحق صاحب دہلوی کا مقدمہ تفسیر حقانی۔ مسٹر گاڈ فرے ہگنس کی کتاب اپالوجی فار محمد۔ سر ولیم میور صاحب کی کتاب لائف آف محمد۔ پروفیسر محمود علی صاحب کی کتاب دین و دانش۔ ایڈورڈ گبن کی تاریخ زوال سلطنت روما۔ وغیرہ

دوسرے الفاظ میں یوں سمجھنا چاہیئے کہ میں نے صرف ایک حقیر شہد کی مکھی کی طرح مختلف پھولوں میں سے شہد کے چند قطرے اخذ کر کے ایک جگہ جمع کر دیئے ہیں۔

قرآن مجید کے متعلق یہ معلومات چونکہ یکجائی طور پر اور کسی کتاب میں اب تک دیکھنے میں نہیں آئے تھے اس لیئے میں نے خود یہ رسالہ مرتب کرنے کی جرات کی ہو۔ میرے مخاطب زیادہ تر اسکولوں اور کالجوں کے مسلمان طلبا ہیں۔ اگر ان طلبا اور ان کے والدین اور سرپرستوں نے میری اس کوشش کو نظر قبول سے دیکھا تو بشرط زندگی میرا ارادہ ہو کہ اسی سلسلہ میں خاص طلبا کے لیئے اور کئی رسالے مرتب کروں جن میں دین اسلام کے دلفریب اور دلکش پہلوؤں کو اسی طرح جدا جدا نمایاں کیا جائے گا۔ اللہ تعالٰے سے دعا ہو کہ اس کی توفیق میرے شامل حال ہو۔ آمین

خاکسار

ادریس احمد

بریلی مورخہ یکم مارچ ۱۹۳۲ء

پہلا باب

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت
(دل و جانم فدائے نامش باد)

مسلّمہ تاریخی واقعات اور مستند شہادتوں سے آنحضرت صلعم کی رسالت کی تصدیق

اس کتاب کا مقصد ناقابل انکار واقعات اور دلائل سے یہ ثابت کرنا ہے کہ قرآن مجید لفظاً اور معناً اللہ تعالےٰ کا کلام ہے لہذا وہ اپنی تمام خصوصیات کے لحاظ سے بے مثل اور بے نظیر ہے۔ اور کسی بشر کی مجال نہیں ہے کہ اس کلام کے ایک چھوٹے سے چھوٹے ٹکڑے کی مانند دوسرا کلام پیش کر سکے۔ لیکن کلامِ الٰہی کی اہمیت اور عظمت ذہن نشین ہونے کے لیے رسول خدا صلعم کی سیرت مبارک سے شناسائی ضروری ہے جن کے ذریعہ سے یہ کلام ہم تک پہونچا۔ کیونکہ پیام کی وقعت پیام بر کی حیثیت سے بہت کچھ وابستہ ہوتی ہے۔ اگر کسی طرح یہ اطمینان ہو جائے کہ یہ رسولؐ سچے ہیں۔ راستباز ہیں۔ اور تمام نیک صفات سے متصف ہیں اور اُن کے رشتہ دار اور دوست احباب

ہی نہیں بلکہ اغیار اور مخالف بھی آپ کو سچا اور راست باز سمجھتے ہیں۔ تو پھر یہ باور کرنا آسان ہو جاتا ہے کہ آپ جو کچھ ارشاد فرماتے ہیں۔ وہ حق ہے۔ یہ بات خلاف قیاس ہے کہ جس شخص کو چالیس برس کی عمر تک دوست اور دشمن سب بالاتفاق سچا۔ متدین اور راستباز تسلیم کرتے رہے ہوں وہ دفعتاً بغیر اپنے کسی ذاتی نفع کی توقع کے اور گوناگوں خطرات میں مبتلا ہو جانے کے قوی اندیشہ کے باوجود غلط گوئی اور افترا پردازی شروع کرے۔ لہذا اس باب میں ہم پہلے آنحضرت صلعم کے چند ابتدائی حالات درج کر کے یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ اپنے اور پرائے آپ کی رسالت کی نسبت کیا رائے رکھتے تھے۔

احادیث میں مذکور ہے کہ جب آنحضرت صلعم سے دریافت کیا گیا کہ وحی کیونکر نازل ہوتی ہے تو آپ نے فرمایا کہ کبھی تو گھنٹہ کی آواز کی طرح آتی ہے اور وہ مجھ پر بہت سخت ہوتی ہے۔ پھر وہ منقطع ہو جاتی ہے اور جو کچھ مجھ سے کہا جاتا ہے میں اسے یاد رکھتا ہوں۔ اور کبھی فرشتہ آدمی کی صورت میں مجھ سے کلام کرتا ہے اور جو کچھ وہ مجھ سے کہتا ہے مجھے یاد ہو جاتا ہے۔

گو وحی کی حقیقت واضح طور پر کسی کو بھی معلوم نہیں تھی۔ مگر یہ سب دیکھتے تھے اور جانتے تھے کہ نزول وحی پیغمبر صاحب پر بہت شاق

گزرتا تھا۔ رنگت فق ہو جاتی تھی۔ اور جسم میں گرانی آجاتی تھی یہاں تک کہ کبھی آپ اونٹنی پر سوار ہیں اور وحی نازل ہوئی تو اونٹنی سے آپ کا بوجھ برداشت نہیں ہو سکتا تھا اور بیٹھ جاتی تھی۔ اور کبھی ایسا ہوا کہ آپ کسی صحابی کے ران پر سر رکھے ہوئے لیٹے ہیں اور وحی نازل ہوئی تو اُس صحابی کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کی ران مارے بوجھ کے ٹوٹ جائے گی جسم کی گرانی اور رنگت فق ہونے کے علاوہ ایک کیفیت یہ بھی تھی کہ کیسی ہی سخت سردی ہو نزول وحی کے وقت آپ پسینے پسینے ہو جاتے تھے۔ نزولِ وحی کے وقت جو حالت پیغمبر صلعم پر طاری ہوتی تھی اُس کو اوقات مختلف میں سیکڑوں صحابیوں نے دیکھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ لوگ نزولِ وحی میں کسی طرح کا شک اور شبہ نہیں کرتے تھے۔ نزول وحی کسی حالت کسی وقت اور کسی مقام کا پابند نہ تھا۔ پیغمبر صلعم وحی نازل ہونے کے وقت الفاظِ وحی کا اعادہ فرمانے میں عجلت فرماتے تھے اور کیفیت نزول وحی زائل ہونے پر آپ فوراً کسی پڑھے لکھے صحابی کو بُلوا کر لکھوا دیتے تھے اور اس کے علاوہ اُسی وقت الفاظ وحی زبان زد صحابہ ہو جاتے تھے۔ پیغمبر صاحب کے زمانہ میں کتابت کا رواج ابتدائی حالت میں تھا۔ اور خاصکر عرب میں یوں بھی لکھنے پڑھنے کا دستور بہت ہی کم تھا۔ لہذا وحی کبھی ہرن کی جھلیوں کبھی اونٹ کی ہڈیوں اور کبھی کھجور کے پتوں پر لکھی جاتی۔ اور اصحاب

میں سے جن کو زیادہ شوق تھا وہ بطور خود وحی کو جمع کرتے جاتے تھے لیکن بالاستیعاب نہیں بلکہ جس کو جو کچھ بہم پہونچا یا جمع کر لیا۔ اس طرح جماعت صحابہ میں پورا قرآن مجید موجود تھا۔

ہم سب جانتے ہیں کہ انسان کے حواس ظاہری اور باطنی زیادہ استعمال کرنے سے زیادہ قوی ہو جاتے ہیں۔ اس زمانہ میں چونکہ لوگ پڑھے لکھے نہ تھے قوت حافظہ کو زیادہ کام میں لاتے تھے اس لیے ان کی قوت حافظہ بہت تیز تھی۔ اور چونکہ اہل زبان تھے اور قرآن مجید کی فصاحت اعلےٰ درجہ کی فصاحت تھی قرآن مجید کا جملہ جملہ ضرب الامثال کے طور پر سب کی زبانوں پر چڑھا ہوا تھا۔ سورتوں کے نام اور آیات کی ترتیب یہ سب کچھ خود پیغمبر صاحب ہی اپنی زندگی میں معیّن فرما گئے تھے جب وحی نازل ہوتی تو کاتبان وحی سے آپ فرما دیا کرتے تھے کہ اس کو فلاں سورت میں فلاں جگہ لکھ لو۔ آپ خود بھی کلام پاک کے حافظ تھے۔ اور دیگر حفاظ کی ایک جماعت تھی وہ بھی قرآن مجید کو آنحضرتؐ کی بتلائی ہوئی ترتیب کے ساتھ تلاوت کیا کرتے تھے۔ آپ کی آخر حیات تک

زید بن ثابت انصاریؓ۔ عبداللہ بن مسعود۔ خلفائے اربعہؓ۔ معاذ بن جبلؓ ابی بن کعب۔ سعد بن ابی وقاصؓ۔ عبداللہ بن ارقمؓ۔ ثابت بن قیسؓ اور اکثر اصحاب صفہؓ وغیرہ ایسے حافظ تھے کہ اول سے آخر تک تمام

قرآن مجید بالترتیب ان کو حفظ تھا۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں اس گئے گزرے زمانہ میں بھی مسلمانوں کے ہر شہر اور گاؤں میں بے شمار حافظ مرد عورت بوڑھے جوان اور بچے موجود ہیں۔ جب اس زمانہ میں ان حفاظ کی جو قرآن مجید کو سمجھتے بھی نہیں یہ کثرت ہو تو عرب جن کے حافظے بہت قوی تھے ہزارہا اشعار جاہلیت کے ان کے نوک زبان تھے سیکڑوں خاندانوں کے نسب نامے اور سلسلے ان کی زبان پر تھے۔ بلکہ گھوڑوں اور اونٹوں کے نسب نامے بھی یاد رکھتے تھے اس پر قرآن مجید کی حلاوت سے واقف تھے۔ اس کی فصاحت و بلاغت کو خوب سمجھتے تھے۔ اس کے روح کو جنبش دینے والے مضامین ان میں نشہ پیدا کرتے تھے۔ اور پھر رات دن کی تلاوت موجب ثواب سمجھی جاتی تھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خود صاحب قرآنؐ ان کے درمیان موجود تھے۔ اور نمازوں میں پڑھا جاتا تھا۔ ان موافق اور موید حالات میں جس قدر حافظ ہو سکتے تھوڑے تھے۔

آنحضرتؐ کے زمانہ میں قرآن مجید تمام و کمال لکھا جا چکا تھا۔ مگر اس کے تمام اجزا کو ایک جلد میں جمع کرنے کی ضرورت ہنوز محسوس نہیں ہوئی تھی۔ آنحضرت صلعم کی وفات سے کچھ دنوں بعد مسیلمہ کذاب کے ساتھ لڑائی ہوئی بہت سے حفاظ نے جام شہادت نوش فرمایا۔ اس وقت

حفاظت قرآن کی ضرورت کا سب سے پہلے احساس ہوا کہ اس کو لکھوا کر ایک جلد میں جمع کرایا جائے۔ چنانچہ سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ نے قرآن مجید کو ایک جگہ جمع کیا۔ جس کے یہ معنے ہیں کہ جو کچھ جھیوں۔ ہڈیوں۔ اور پتوں پر لکھا ہوا تھا۔ اور سینوں میں محفوظ تھا۔ آپ نے حفاظ کی مدد سے سب کو ایک جگہ بالترتیب لکھوا کر اُم المومنین حفصہؓ کے پاس رکھوا دیا حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں دور دراز ممالک میں اسلام پہونچ چکا تھا۔ عراق۔ مصر۔ شام اور ایران وغیرہ بلاد کے لوگ کثرت سے مسلمان ہو گئے تھے اور ہر جگہ حفاظ نہ پہونچ سکتے تھے اور اختلافات کا اندیشہ تھا اس لیے حضرت عثمانؓ نے یہ کیا کہ اس قرآن مجید کی نقلیں کرا کے حفاظ کی تصدیق کے بعد جگہ جگہ بھیج دیں اور متفرق اور منتشر طور پر جو جس کے پاس تھا اس کو سدِ اختلاف کی غرض سے تلف کرا دیا۔ اور جیسا کہ خود قرآن مجید میں اعلان موجود ہے (جس کا ذکر آئندہ آئے گا) اللہ تعالے نے اپنے کلام کی حفاظت کا ایسا مستحکم انتظام فرمایا کہ دنیا میں جس قدر قرآن لکھے گئے اور لکھے جائیں گے اُن میں زیر و زبر بلکہ ایک نقطہ کا بھی فرق نہ ہوگا۔ یہ وہ خصوصیت ہے جو کسی قوم کی کسی کتاب کو اس وقت تک نصیب نہیں ہوئی اور آئندہ ہوگی بھی نہیں۔

صحتِ ترتیب قرآن مجید کے متعلق خود قرآن شریف میں بھی لاندونی

قوی شہادت موجود ہے۔ جب آنحضرت صلعم پر وحی نازل ہوا کرتی تھی تو آپ اُس کے الفاظ دُہرانے میں عجلت فرمایا کرتے تھے تا کہ وحی الٰہی کے تمام الفاظ حافظہ میں بالترتیب محفوظ ہو جائیں۔ اللہ تعالےٰ نے آپ کو اطمینان دلا دیا کہ آپ کو عبارت یاد رکھنے کی غرض سے الفاظ دُہرانے میں عجلت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ (یعنی اُس کا جمع کر دینا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے۔ سورۂ قیامۃ پہلا رکوع) صاف ظاہر ہے کہ اس آیت میں لفظ جَمْعَهٗ میں ترتیب کا مفہوم غالب ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے ترتیب کلام وحی کی صحت بھی اپنے ذمہ رکھی۔ اس آیت میں سے ترتیب کا مفہوم خارج کر دینے سے یہ ارشاد باری نعوذ باللہ عبث ہوا جاتا ہے۔ کیونکہ خلاصۂ وحی یا وحی کا صرف مطلب یاد رکھنا ایسا مشکل کام نہ تھا جس کے لیئے ایسے اہم وعدے کی ضرورت پڑتی نیز اللہ تعالیٰ نے حفاظت قرآن مجید کا صاف صاف اعلان فرمایا ہے۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ٥ (یعنی بے شک ہم ہی نے قرآن اُتارا ہے اور بیشک ہم ہی اُس کے نگہبان ہیں۔ سورۂ الحجر رکوع) ترتیب بھی کتاب کا جزو اہم ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک کی حفاظت کا ایسا مضبوط اور قابل اعتماد انتظام فرما دیا ہے کہ قیامت تک اُس میں کسی قسم کی تحریف ترمیم کمی بیشی اور تغیر و تبدل کا اندیشہ نہیں رہا۔

لیکن اگر مرضی الٰہی کے مطابق کلام الٰہی کی شیرازہ بندی نہ ہوئی ہوتی اور صرف بے ترتیب کلام کی حفاظت کا وعدہ ہوتا تو آیات کی ترتیب میں مختلف علما کی رائے کے مطابق ردّ و بدل ہونے سے عیسائیوں کی چار انجیلوں کی طرح کتاب اللہ کی بھی متعدد صورتیں پیدا ہو جاتیں۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ کیا عقل سلیم اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ اللہ تعالےٰ اپنے کلام کی خود حفاظت کرنے کا ایسا صاف وعدہ فرمانے کے باوجود اس کلام کی ترتیب کو ایک نزاعی مسئلہ بنانے کے لیے تمیز بشری پر چھوڑ دیتا جب قرآن مجید کی موجودہ ترتیب کے علاوہ اور کوئی ترتیب دنیائے اسلام میں مسلّم نہیں ہے۔ اور اس ترتیب سے کسی اور مختلف ترتیب کا دنیا میں کوئی حافظ نہ پہلے گزرا ہے نہ اس وقت موجود ہے۔ تو ظاہر ہے کہ موجودہ ترتیب ہی "اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ" اور "اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْن" کے صریح وعدوں کی مصداق ہے۔ اگر کسی اور غیر معروف ترتیب کی صحت کا کوئی شخص مدعی ہو تو وہ ترتیب مسلمانوں میں کہیں مروج نہیں ہے نہ اس ترتیب کی حفاظت کے کسی انتظام و اہتمام کا پتہ چلتا ہے حالانکہ حفاظت قرآن مجید کی حفاظت کے متعلق اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے۔

نبوت سے قبل آنحضرتؐ آبادی سے دو تین میل دور پہاڑ پر تشریف لے جاتے اور ایک کھوہ میں جو غار حرا کے نام سے مشہور ہے کئی کئی دن تک عبادت اور مراقبہ میں مشغول رہتے تھے۔ ایک روز غار حرا میں حسب معمول

آپ محوِ عبادت تھے کہ فرشتہ پہلی بار وحی لیکر آیا۔ اور سورہ "علق" (اقراء باسم ربک الذی خلق) کی ابتدائی آیتیں نازل ہوئیں۔ اس فرشتہ نے یہ خوشخبری بھی سنائی کہ اللہ تعالےٰ نے آپ کو اپنا رسول منتخب کیا ہے۔ اس نزول وحی کے بعد آپ پریشان خاطر اور خوف زدہ اپنے گھر تشریف لائے اور اپنی بیوی خدیجہؓ سے اس واقعہ کا ذکر کیا۔ حضرت خدیجہؓ نے جو مکہ کی ایک آسودہ حال دانشمند خاتون تھیں اور نزول وحی سے پیشتر پندرہ برس کے رات دن کے تجربہ سے آپ کی صفات۔ دیانت و امانت، سچائی، حق دوستی اور حق پسندی اور رعایت درجہ کی عقل و فہم سے بخوبی واقف تھیں آپ کی بات سن کر فرمایا "یا حضرت آپ تو نیکی کرتے ہیں۔ بیکسوں اور مسکینوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔ غریبوں اور محتاجوں کو صدقہ دیتے ہیں۔ یتیموں اور بیواؤں کی پرورش کرتے ہیں۔ عزیزوں کے ساتھ احسان کرتے ہیں کسی کا دل نہیں دکھاتے۔ مقروضوں کا بار اٹھاتے ہیں حق کی حمایت کرتے ہیں اور مصیبتوں میں لوگوں کے کام آتے ہیں۔ ایسے نیک بندے کو اللہ تعالیٰ کبھی غمگین نہ کرے گا۔"

آنحضرت صلعم کی تبلیغ اسلام کی سب سے پہلی اور ممتاز خصوصیت یہ تھی کہ آپ نے اپنے گھر سے تبلیغ شروع کی۔ اور سب سے پہلے آپ کی بیوی حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ آپ پر ایمان لائیں۔ ان کے بعد حضرت علی کرم اللہ

وجہ نے جو آپ کے چچا زاد بھائی تھے اور جن کی عمر اس وقت آٹھ سال کی تھی اسلام قبول کیا۔ پھر حضرت ابوبکر صدیقؓ مشرف باسلام ہوئے۔ یہ اپنی قوم یعنی قبائل قریش میں نہایت ہر دلعزیز اور صاحب ثروت و دولت تھے۔ چوتھے ایمان لانے والے حضرت زید بن حارثہؓ تھے جن کا عرف زید بن محمد تھا۔ یہ پہلے حضرت خدیجہؓ کے غلام تھے انھوں نے آنحضرت صلعم کو ہبہ کر دیا تھا۔ اور آپ نے اُن کو متبنٰی بنا لیا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ ایمان لانے کے بعد اپنے دوستوں کو بھی اسلام کی تلقین کرنے لگے۔ چنانچہ اُن کی کوشش سے حضرت عثمان بن عفانؓ۔ زبیر بن عوامؓ۔ عبدالرحمٰن بن عوفؓ سعد بن ابی وقاصؓ۔ طلحہ بن عبید اللہؓ۔ ابوعبیدہؓ بن جراح۔ ابوسلمہؓ ارقم مخزومیؓ۔ عبیدہ بن حارثؓ۔ اور سعید بن زیدؓ نے اسلام قبول کیا آنحضرت صلعم ان لوگوں کے ساتھ ارقم مخزومیؓ کے گھر میں جمع ہوتے تھے اور وہاں قرآن مجید کی تعلیم دیتے تھے۔ سُنتے ہیں کہ یہ گھر مکّہ میں اب تک باقی ہے مگر افسوس ہے کہ اس کی تاریخی عظمت کے لحاظ سے اس کی طرف توجہ نہیں کی گئی

آنحضرت صلعم کے گھر والوں اور عزیز ترین دوستوں کا سب سے پہلے آپ پر ایمان لانا کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے کوئی شخص دوسروں سے اپنی بات تب ہی منوا سکتا ہے جبکہ وہ خود سچّا اور معتبر ہو۔ اور جس کی صداقت اور راست بازی کے صرف اغیار ہی معترف نہ ہوں بلکہ اس کے گھر کے

لوگ اور اُس کے قریب رشتہ دار اور دوست بھی اُس کو مخلص اور سچا سمجھتے ہوں۔ کیونکہ گھر والوں کو ذرا ذرا سی باتوں کی خبر رہتی ہے۔ اُن کے سامنے کسی قسم کی مکاری اور عیاری نہیں چل سکتی۔ غیر لوگ تو ممکن ہے کہ اُس کی چکنی چپڑی اور جھوٹی سچی باتیں مان لیں۔ مگر گھر کے بھیدیوں کو بہکانا محال ہے۔ آپ کی بیوی آپ کی بعثت سے قبل پندرہ سال آپ کی زوجیت میں رہ چکی تھیں۔ لہذا آپ کی عادات و اطوار سے بخوبی واقف تھیں۔ اسی طرح آپ کے رشتہ دار اور آپ کے دوست احباب آپ کی سیرت اور خصائل سے بخوبی واقف تھے۔ اور آپ کے ذرا ذرا حالات سے باخبر تھے اس قدسی صفات انسان کی امانت اور دیانت نے ہموطنوں کی طرف سے اُس کے لیئے "امین" کا لقب حاصل کیا تھا۔ اس کی راست گوئی اور راست بازی دوست و دشمن سب کو یکساں تسلیم تھی۔ جب آنحضرتؐ نے اسلام پیش کیا تو یہ سب لوگ بلا پس و پیش آپ پر ایمان لے آئے۔ یہ کوئی افسانہ نہیں ہے بلکہ کھُلا ہوا تاریخی واقعہ ہے جو سب کو تسلیم ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ آنحضرتؐ اپنے گھر کے اندر مکر و فریب کا ایسا گہرا جال بچھاتے کہ پندرہ برس تک آپ کی بیوی اور قریب کے رشتہ داروں کو آپ کی عیاری کا پتہ نہ چلتا ایک آدمی چند لوگوں کو کچھ عرصہ کے لیئے دھوکا دے سکتا ہے۔ مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک شخص تعداد کثیر کو ہمیشہ دھوکے میں مبتلا رکھ سکے۔ اگر حضرت پر

ایمان لانے والوں کو آپ کی صدق نیت اور آپ کے تبلیغی مواعظ و احکام کے منجانب اللہ ہونے کا یقین نہ ہوتا تو کیا یہ ممکن تھا کہ سمجھدار عورتیں اور اعلیٰ درجہ کے ذی وقعت اور دانشمند اشخاص جن کی لیاقتیں سلطنت جمہوریہ اسلامی کی سرداری اور سپہ سالاری میں اپنے اپنے موقعہ پر آفتاب نیم روز کی طرح چمک کر ثابت ہوئیں۔ دنیا طلبی اور مکر و فریب اور فقدانِ ایمان۔ اور نقصان اور سفاہت عقل کی کوئی علامت ذرا بھی آپ میں پاتے اور فوراً آپ کی بات رد نہ کر دیتے۔ اور کیا باپ بیٹوں سے اور مائیں بیٹوں سے اور بہنیں بہنوں سے اور بھائی بھائیوں سے اس طرح جدا ہونا گوارا کر سکتے تھے جس طرح اسلام اور بانیِ اسلام کی محبت سے اپنے آبائی اور عزیز مذہب کو چھوڑ کر جدا ہو گئے۔ اور کیا ملک و مال اور عزیز و اقارب اور پیارے وطن کی الفت پر خاک ڈال کر غریب الوطنی کی زندگی اختیار کرنا پسند کرتے۔ پاؤں میں بیڑیاں بندھے ہوئے بھوکے پیاسے مکہ کی نہایت گرم اور تیز دھوپ میں سینہ پر بھاری پتھر رکھ کر جلتی ہوئی پتھریلی زمین پر ڈالدیئے جانے کو عیش و آرام کی زندگی پر ترجیح دیتے۔ اور برسوں تک اپنی قوم سے بالکل بے تعلق اور الگ قیدیوں کی سی زندگی بسر کرنے اور طرح طرح کی تکلیفیں اور مصیبتیں سہنے اور اپنی جانوں کو خطرہ میں ڈالنے کو مرغوب سمجھتے ہرگز نہیں۔ چنانچہ سر ولیم میور جو ایک بہت بڑے عالم اور محقق انگریز تھے

اور ۱۸۶۸ء سے ۱۸۷۴ء تک ہمارے صوبۂ متحدہ کے لفٹنٹ گورنر رہ چکے ہیں۔ اور جنھوں نے نہایت تحقیق و تفتیش کے ساتھ آنحضرت صلعم کی سوانح عمری (لائف آف محمدؐ) چار جلدوں میں لکھ کر شایع کی وہ اپنی اسی کتاب میں فرماتے ہیں کہ "حضرت محمدؐ کے اخلاص اور صداقت کا یہ بڑا زبردست ثبوت ہے کہ ان کا

مذہب سب سے پہلے قبول کرنے والے اُن کے دلی دوست اور اُن کے گھرانے کے لوگ تھے۔ یہ لوگ سب کے سب ضرور اُن کے روزمرہ کے حالات اور اُن کی گھریلو زندگی سے بخوبی واقف ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ دوسروں کو دھوکا اور فریب دینے کی غرض سے مکّاری اور عیّاری سے کام لیتے ہیں تو اُن کے اُن افعال میں جو محض دوسروں کے سنانے کے لیئے وہ باہر مجمع عام میں کیا کرتے ہیں اور گھر کی چار دیواری کے اندر اُن کے اعمال میں عموماً ہمیشہ فرق اور اختلاف ہوا کرتا ہے۔ اگر محمدؐ کی غرض و غایت فریب اور دھوکے سے کام لینا ہوتا تو یہ ناممکن تھا کہ اُن کے دوست اور احباب اور اُن کے قریبی رشتہ داروں کو جو اُن پر سب سے پہلے ایمان لائے اُن کی ریاکاری اور عیّاری کا پتہ نہ چل جاتا۔"

مسٹر گاڈفرے ہگنس انگلستان کے ایک آسودہ حال مشہور عالم و فاضل اور محقق عیسائی ہیں جنھوں نے باوجود عیسائی مذہب رکھنے کے ازراہ

منصف مزاجی اب سے سو برس پیشتر ۱۸۲۹ء میں ایک کتاب "اپالوجی فار محمدؐ" صرف اس غرض سے تصنیف کی تھی کہ عیسائی عالموں اور پادریوں نے از راہ تعصب اسلام اور بانی اسلام کے خلاف جو تہمتیں تراشی ہیں اور تمام ممالک یورپ میں اسلام اور پیغمبر عرب کی طرف سے بدظنی اور نفرت پھیلانے کی غرض سے جن بن دروغ بافیوں اور افترا پردازیوں سے کام لیا ہے اُن کا پردہ فاش کریں تاکہ دین اسلام کی حقیقت سے آگاہ ہوکر اہل یورپ اور خصوصاً اہل انگلستان کے دلوں میں اسلام اور مسلمانوں کی ساتھ رواداری کے جذبات پیدا ہوں۔ بالخصوص اس لیے کہ انگلستان سے مسلمانوں کی ایک تعداد کثیر کا تعلق ہے اور ان کی فلاح و بہبود سے انگلستان کو خاص دلچسپی ہے۔ آپ اپنی کتاب "اپالوجی فار محمدؐ" کے فقرہ ۱۷ میں فرماتے ہیں کہ "اگر حضرت محمدؐ اپنی نبوت کے دعوے میں سچے تھے تو اُن کی بیوی

خدیجہؓ کا اُن پر سب سے پہلے ایمان لانا کچھ بھی تعجب کی بات نہ تھی۔ لیکن اگر محمدؐ فریبی اور مکار تھے تو خدیجہؓ سے عقد کے بعد اظہار نبوت کے دن تک اپنی بیوی کو پندرہ سال مسلسل دھوکے میں رکھنے کے لیے اُنھوں نے حد درجہ کی عیاری سے کام لیا ہوگا۔ کیونکہ یہ سب کو بالاتفاق تسلیم ہے کہ خدیجہؓ اُن کے مذہب پر صدق دل سے ایمان لائیں۔ اور اُن کی سچی معتقد تھیں۔ نہ وہ

منافق تھیں۔ اُن کی نسبت کسی نے آج تک یہ بدظنی کی حد
کہ وہ اپنے شوہر کے مکر و فریب کی کارروائیوں میں شریک یا
ہمراز تھیں۔ خدیجہؓ کے بعد اُن کے چچا زاد بھائی علیؓ ابن ابوطالب
ایمان لائے اور پھر ابوبکرؓ نے دین اسلام قبول کیا۔ چونکہ ابوبکرؓ
سب سے زیادہ دولتمند لوگوں میں سے تھے اور ہم چشموں میں
بڑے عقلمند اور تجربہ کار سمجھے جاتے تھے۔ آپ کے ایمان لانے سے
محمدؐ کو بہت کچھ مدد ملی۔ اور اُن کے مذہب کی شہرت ہوگئی
اور آپ کی مثال سے متاثر ہوکر اور کئی شخص ایمان لائے
جن میں عثمان ابن عفانؓ۔ زبیر بن عوام رضؓ۔ سعد بن ابی وقاصؓ
عبدالرحمٰن بن عوف رضؓ۔ اور ابوعبیدہ بن جراح رضؓ بھی شامل
تھے جو کہ بعد میں اسلامی افواج کے سپہ سالار بنے۔ اور جن کی
بدولت اسلام کو بڑی بڑی فتوحات میسر ہوئیں؛"

پیغمبر اسلام کی تبلیغ کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ آپ پر جو لوگ سب سے
پہلے ایمان لائے وہ بڑے بڑے قابل دانشمند اہل الرائے اور مکہ کے
چیدہ افراد تھے۔ جنھوں نے آپ کی وفات کے بعد زبردست حکومت اور
سپہ سالاریاں کیں اور حکومت کا بہت عمدہ انتظام کیا۔ اور ساری دُنیا
پر اپنے تدبّر اور اپنے عدل و انصاف کا سکہ بٹھا دیا۔ چنانچہ مسٹر گاڈ فرے ہگنس

اپنی کتاب کے فقرہ نمبر ۱ میں تحریر فرماتے ہیں کہ

"باوجودیکہ محمدؐ اور عیسٰیؑ کی ابتدائی سوانح عمری میں ایسے حالات ہیں جن میں عجیب مشابہت پائی جاتی ہے۔ لیکن بہت سے امور ایسے ہیں جن میں سراسر اختلاف ہے۔ مثلاً حضرت عیسٰیؑ پر سب سے پہلے ایمان لانے والے آپ کے بارہ حواریوں کی نسبت تسلیم کیا جاتا ہے کہ وہ ناخواندہ۔ بے سمجھ اور بہت ہی کم حیثیت لوگ تھے اس کے برعکس محمدؐ پر سب سے پہلے ایمان لانے والے اُن کے غلام زید کے سوا سب کے سب معزز طبقہ کے لوگ تھے اور اپنے اپنے وقت پر بہ حیثیت خلیفہ اور سپہ سالار افواج کے ان لوگوں نے اپنے شاندار کارناموں سے آئندہ زمانہ میں ثابت کر دیا کہ یہ سب کے سب نہایت قابل اور اعلیٰ درجہ کے دل و دماغ رکھنے والے لوگ تھے۔ ایسے سیدھے سادے لوگ نہ تھے جو آسانی سے کسی کے دام فریب میں پھنس جاتے حضرت عیسٰیؑ پر ایمان لانے والوں کی بےکسی اور کم حیثیتی کو بعض عیسائی علماء دین عیسوی کی خوبی سمجھتے ہیں اور اُس کو دین عیسوی کی آئندہ کامیابی کا سبب قرار دیتے ہیں مگر مجھ سے کوئی سچ پوچھے تو مجھے اُس حالت میں خوشی ہوتی اگر

حضرت عیسٰے پر سب سے پہلے ایمان لانے والوں میں لاک
اور نیوٹن جیسی حیثیت کے فلاسفر اور حکیم ہوتے"۔

(فقرہ ۱۹) "ابتدائی چند سالوں میں اپنے دین کی تبلیغ میں محمدؐ کو کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ مخالفوں کی جانب سے اُن کی جو توہین اور تحقیر کی جاتی تھی اور اُن کے ساتھ تمسخر کیا جاتا تھا اور طرح طرح کی دھمکیاں اُن کو دی جاتی تھیں اُن کی انھوں نے مطلق پروا نہیں کی اور بلا خوف و خطر اپنے مذہب کی تبلیغ میں مصروف رہے۔ یہاں تک کہ چوتھے سال کے ختم پر عیسائی مورخوں کی شہادت کے مطابق صرف ۳۹ شخص اُن پر ایمان لائے تھے جنمیں ایک عمرؓ بن خطاب بھی شامل ہیں جو اہل مکہ میں نہایت سربرآوردہ شخص تھے۔ اور جو اپنی غیر معمولی قابلیتوں کی بدولت آگے چل کر خلیفۂ اسلام اور قریب قریب ساری ایشیا پر حکمراں بنے"۔

(فقرہ ۲۶) "باوجود پادری صاحبان اور عیسائی مصنفین کی بے شمار غلط بیانیوں اور دروغ بافیوں کے ہجرت کے وقت تک محمدؐ صاحب کی زندگی اور اُن کے اخلاق اور اُن کا چال چلن نہایت عمدہ اور اعلیٰ درجہ کا تسلیم کیا جاتا ہے۔ سوائے اُن کے آئندہ پر فریب منصوبوں کے کوئی عیسائی مورخ ایک الزام بھی اُن پر عائد نہیں کر سکا ہے"۔

(تفہ صد ۲۲) "تمام عیسائی مؤرخ بالاتفاق تسلیم کرتے ہیں کہ ابتدا سے لیکر وسط عمر تک محمدؐ کی سیرت اور چال چلن بہت اچھا ہا جس کے خلاف کچھ نہیں کہا جا سکتا تو پھر بھلا یہ کیونکر مان لیا جاسے کہ پچیس[۲۵] سال کی عمر سے لیکر چالیس سال کی عمر تک سب کچھ قریب تھا پچیس برس کی عمر تک وہ نہایت متدیّن اور جفاکش رہے۔ اُن کی دیانت پر کسی کو شک و شبہ نہ تھا اور اس دیانت اور جفاکشی کے صلہ میں اُن کو دولت اور امارت میسر ہوئی تو کیا اس خوش نصیبی اور آسودگی نے اس متدیّن اور دیانتدار شخص کو یکایک مکار اور دغا باز بنا دیا اس حیرت انگیز قلب ماہیت کے دو مقصد قرار دیئے جا سکتے ہیں (۱) دنیاوی حکمرانی یا (۲) عورتوں کے ساتھ عیش اور نفس پرستی"

"اگر محمدؐ کو امارت اور حکومت مقصود تھی تو اُس کی سب سے پہلی تدبیر یہ تھی کہ وہ کعبہ کا متولی بننے کی کوشش کرتے خصوصاً اس لیئے کہ کعبہ کی تولیت اُن کے خاندان میں چلی آتی تھی۔ اور یہ کعبہ کی تولیت تمام ملک عرب میں اعلیٰ درجہ کا رتبہ اور منصب سمجھا جاتا تھا۔ یا عیش اور نفس پرستی انھوں نے سب سے پہلے اپنی شادی ایک بیوہ عورت (خدیجہؓ) سے کی جو عمر میں اُن سے پندرہ برس بڑی تھی۔ اور خود اُن کی عمر اُس وقت پچیس[۲۵] برس کی تھی۔ جو عین عروج شباب کا زمانہ

تھا۔ اور اگرچہ ملکی رسم کے مطابق اُن کو کئی بیویاں رکھنے کی اجازت تھی مگر اُنھوں نے خدیجہؓ کے مرنے تک کوئی دوسری شادی نہیں کی۔ اور اس ایک بیوی کے ساتھ حد درجہ کی وفاداری اخلاص اور محبّت کا برتاؤ رہا۔ خدیجہؓ کے انتقال کے وقت محمدؐ کی عمر پچاس سے زیادہ تھی یعنی شباب ختم ہوچکا تھا۔ کیا ایسا شخص جو صورت اور سیرت میں یکتا مانا جاتا ہو ایک چالیسؔ سالہ بیوہ عورت کے ساتھ اُس کی محبت کی نسبت اس کے سوا اور کیا خیال کیا جا سکتا ہے کہ چونکہ ضرورت کے وقت خدیجہؓ اُس کی سب سے زیادہ حقیقی دوست ثابت ہوئی لہذا جذبات تشکر اور احسانمندی نے محبت کی صورت اختیار کر لی۔ اور تشکر گزاری اور احسانمندی صفت محمود ہے۔"

آگے چل کر مسٹر گاڈفرے ہگنس نے اپنی کتاب کے فقرہ ۱۲ میں انگلستان کے مشہور و معروف مورّخ ایڈورڈ گبن مصنف تاریخ زوال سلطنت رومۃ الکبریٰ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ

"پہلے چار خلیفوں کے اطوار یکساں مخلصانہ اور اعلیٰ درجہ کے تھے اُن کی سرگرمی دلسوزی اور اخلاص پر مبنی تھی ثروت اور اختیار پاکر بھی اُنھوں نے اپنی عمریں ادائے فرایض اخلاقی و مذہبی میں صرف کیں

یہی لوگ محمدؐ کے ابتدائی مشرکین تھے۔ جو بیشتر اس کے کہ اُس نے اقتدار حاصل کیا یعنی تلوار پکڑی اُس کے جانبدار ہو گئے۔ اور ایسے وقت میں کہ وہ ہدف آزار تھا اور جان بچا کر اپنے وطن سے چلا گیا۔ ان لوگوں کے سب سے پہلے تبدیل مذہب کرنے سے ان کی سچائی ثابت ہوتی ہے۔ اور پھر دنیا کے فتح کرنے سے ان کی قابلیتوں کی فوقیت ثابت ہوتی ہے"

اسی سلسلہ میں مسٹر گاڈفرے ہگنس اپنی کتاب کے اگلے فقرہ میں تحریر کرتے ہیں کہ "اس صورت میں کون یقین کر سکتا ہے کہ ایسے شخصوں نے طرح طرح کی ایذائیں سہیں۔ اور اپنے ملک سے جلاوطنی گوارا کی اور نہایت سرگرمی سے اُس کے پیرو ہوئے۔ اور یہ سب اُمور ایک ایسے شخص کے لیے ہوں جس میں ہر طرح کی بدکاریاں اور بُرائیاں ہوں۔ اور ایک ایسے سلسلۂ فریب و عیاری کی خاطر ہوں جو اُن ایمان لانے والوں کے خیالات، رجحانات اور دیرینہ مذہبی عقاید کے سراسر منافی ہو، ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اور نہ ایسا ہونا ممکن ہے۔

(فقرہ ۱۳۳) عیسائی اس بات کو یاد رکھیں تو اچھا ہو کہ محمدؐ کے اصولوں نے اُس کے پیروؤں میں جس درجہ کا نشۂ دینی پیدا کیا تھا اُس کو عیسےٰ کے ابتدائی پیروؤں میں تلاش کرنا بے سود ہے۔ اور اس کا مذہب اس تیزی کے

ساتھ پھیلا جس کی نظیر دین عیسوی میں نہیں ملتی چنانچہ نصف
صدی سے کم میں اسلام بہت سی عالیشان اور سر سبز سلطنتوں پر
غالب آگیا۔ جب عیسےؑ کو سولی دی گئی تو اُس کے پیرو بھاگ گئے۔
برعکس اس کے محمدؐ کے پیرو اپنے مظلوم پیغمبر کے گرد جمے رہے اور اس
کی حفاظت کی خاطر اپنی جانیں خطرہ میں ڈالکر اُس کو کل دشمنوں پر
غالب کر دیا۔"

اینسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کا فاضل مقالہ نگار "محمدؐ اور اُس کا مذہب" کے عنوان
کے تحت میں لکھتا ہے کہ

"جو یقین کہ اُس نے (آنحضرت صلعم نے) اپنے قریب کے لوگوں یعنی خدیجہؓ
ابوبکرؓ اور عمرؓ کے دل میں پیدا کیا اور جو ہر طرح کی تکلیف اور ذلت
اُس نے بارہ برس تک جھیلی۔ اور نہایت جوانمردی سے ہر قسم کی دولت
اور سرداری قبول کرنے سے انکار کر دیا جس کا حاصل ہونا صرف
اس شرط پر موقوف تھا کہ وہ اپنی کوشش سے باز آئے۔
نیز اُس سادہ مزاجی اور سادہ طرز معاشرت کا خیال کرکے جو آخری
وقت تک اُس میں قائم رہی ہم پریڈو۔ والٹیر اور مراثی کی
رائیں قبول نہیں کر سکتے بلکہ مہلر۔ کاسین۔ کارلائل۔ ارونگ
اور دیگر محققین سے متفق ہیں کہ عام طور پر محمدؐ کی صداقت کو تسلیم کریں اور

اس بات کو قبول کریں کہ اس کو اپنے اوپر بھروسہ تھا۔ اور وہ اپنی
رسالت کو برحق سمجھتا تھا"

مسٹر ٹامس کارلائل انگلستان کے ایک نہایت مشہور مصنف ہیں جو اپنے علم و فضل کی وجہ سے تمام یورپ میں غیر معمولی شہرت رکھتے تھے۔ وہ اپنی شہرہ آفاق کتاب "ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ" (لکچر دوم صفحہ ۴۲) میں جو پہلی بار ۱۸۴۰ء میں شائع ہوئی تھی تحریر فرماتے ہیں کہ

"ہم محمدؐ کی نسبت ہرگز یہ خیال نہیں کر سکتے کہ وہ صرف ایک شعبدہ باز اور تہی باطن شخص تھا۔ اور نہ ہم اس کو ایک حقیر جاہ طلب اور دیدہ و دانستہ منصوبے گانٹھنے والا شخص کہہ سکتے ہیں جو سخت اور کرخت پیغام اس نے دنیا کو دیا وہ ہر حال میں ایک سچا اور حقیقی پیغام تھا۔ اس کا ماخذ وہی ہستی تھی جس کی تھاہ کسی نے بھی نہیں پائی اس شخص کے نہ اقوال ہی جھوٹے تھے نہ اعمال۔ اور نہ وہ خالی انصدا تھے۔ کسی کی نقل و تقلید تھے۔ حیات ابدی کا ایک نورانی وجود تھا۔ جو قدرت کے وسیع سینہ میں سے دنیا کو منور کرنے نکلا تھا اور بلاشبہ اس کے لیے امر ربانی یوں ہی تھا"

مسٹر ٹامس کارلائل کی مذکورہ بالا کتاب "ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ" کی عبارت ذیل سرسید احمد خاں صاحب مرحوم نے اپنی مشہور کتاب "خطبات احمدیہ

کے دیباچہ میں نقل کی ہی کہ

"ہم لوگوں (یعنی عیسائیوں) میں جو یہ بات مشہور ہی کہ محمدؐ ایک پرفن اور فطرتی شخص اور گویا جھوٹ کے اوتار تھے اور اُن کا مذہب دیوانگی اور خام خیالی کا ایک تودہ ہی۔ اب یہ سب باتیں لوگوں کے نزدیک غلط ٹھہرتی جاتی ہیں۔ جو جو جھوٹ باتیں سرگرم مذہبی لوگوں (یعنی عیسائیوں) نے اُس انسان (یعنی محمدؐ) کی نسبت قایم کی ہیں اب وہ الزام قطعاً ہماری روسیاہی کا باعث ہیں۔ چنانچہ یہ ایک روایت مشہور ہی کہ **پوکاک** صاحب نے جب گروٹیس صاحب سے پوچھا کہ یہ قصہ جو تم نے لکھا ہی کہ محمدؐ نے ایک کبوتر کو تعلیم کیا تھا کہ وہ اُن کے کان سے مٹر نکالا کرتا تھا اور مشہور کیا تھا کہ وہ فرشتہ ہی جو اُن کے پاس وحی لاتا ہی تو اس قصہ کی کیا سند ہی۔ تو انھوں نے جواب دیا کہ "اس قصہ کی کوئی سند اور کچھ ثبوت نہیں ہی حقیقت یہ ہی کہ اب وہ وقت آگیا ہی کہ ایسے ایسے قصوں کو بالکل ترک کیا جائے۔ جو جو باتیں اس انسان (محمد) نے اپنی زبان سے نکالیں بارہ سو برس سے اٹھارہ کروڑ آدمیوں کے لیئے بمنزلہ ہدایت کے قایم ہیں۔ ان اٹھارہ کروڑ آدمیوں کو بھی اسی طرح خدا نے پیدا کیا ہی جس طرح ہم کو پیدا کیا۔ اس وقت جتنے آدمی محمدؐ کے کلام پر اعتقاد رکھتے ہیں

اُن سے بڑھکر اور کسی کے کلام پر اس زمانہ کے لوگ تیقین نہیں رکھتے
پھر کیا ہم یہ خیال کرسکتے ہیں کہ جس کلام پر خدائے قادر مطلق کی
اس قدر مخلوق زندگی بسر کر گئی اور اُسی پر مر گئی کیا وہ ایسا جھوٹا
کھیل ہے جیسا کہ ایک بازیگر کا ہوتا ہے (اس موقع پر سرسید احمد خاں
صاحب مرحوم نے حاشیہ پر ایک نوٹ لکھا ہے جو آخر میں نقل کر دیا گیا
ہے۔ مولف) میں اپنے نزدیک ہرگز ایسا خیال نہیں کرتا میں اور
بہت سی باتوں کا یقین کرسکتا ہوں مگر اس بات کا یقین نہیں سکتا
اگر جھوٹی اور فریب کی باتیں دنیا میں اس قدر طاقتور ہوں اور
رواج پکڑ جائیں اور مسلّم ٹھہر جائیں تو پھر اس دنیا کی نسبت کوئی
کیا خیال کرے گا۔ اس قسم کے خیالات جو بہت پھیلے ہوئے ہیں
بہت ہی افسوس کے قابل ہیں۔ اگر ہم کو خدا کی سچی مخلوقات کا
علم کچھ حاصل کرنا منظور ہو تو ہم کو ایسی باتوں پر ہرگز یقین نہ کرنا
چاہیئے۔ یہ باتیں ایسے زمانوں میں پھیلی تھیں جبکہ شکوک اور
بے اعتباری کا دور دورہ تھا روحانیت اور اخلاق مفلوج ہو چکے
تھے۔ میرے نزدیک اس خیال سے کہ ایک جھوٹے آدمی نے ایک
مذہب قایم کیا اور کوئی زیادہ بد اور ناپاک خیال دُنیا میں
نہیں پھیلا۔ بھلا یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ ایک جھوٹا آدمی جو چونہ

اینٹ اور مسالہ کی خصوصیات پر اعتقاد نہ رکھتا ہو اور پختہ مکان
بنالے۔ وہ پختہ مکان کاہے کو ہوگا بلکہ خاک کا ایک ڈھیر ہوگا
بارہ سو برس تک اُس کو کب قیام ہوسکتا ہے۔ اور اٹھارہ کروڑ
آدمی اُس میں کیسے رہ سکتے ہیں۔ بلکہ اب تک وہ مکان کبھی کا سر کے
بل گر پڑا ہوتا۔ ضرور ہے کہ آدمی اپنے طریقوں کو قانون قدرت
کے مطابق کرے اور قدرت کے اسباب کی حقیقت کو سمجھے اور
اُس پر عمل کرے ورنہ قدرت سے اُس کو یہ جواب ملے گا کہ نہیں
یہ ہرگز نہیں ہوسکتا۔ عیاری عیاری ہی ہے۔ اور صداقت
صداقت ہی ہے۔ افسوس ہے کہ بعض شخص مثل[۵] کاگ لسٹرو اور
اُس جیسے بہت سے دنیا کے سربرآوردہ لوگ چند روز کے لیے
اپنی عیاری سے کامیاب ہوجاتے ہیں مگر اُن کی کامیابی ایک
جعلی ہنڈوی کی مانند ہوتی ہے جس کو وہ اپنے نالائق ہاتھوں سے
جاری کرتے ہیں اور خود الگ تھلگ رہتے ہیں مگر اوروں کو
اس کے سبب سے نقصان پہونچاتے ہیں مگر قدرت آگ کے شعلوں
اور فرانسیسی ہنگاموں اور اسی قسم کی غضبناک صورتوں میں ظاہر

---

[۵] کاگ لسٹرو سسلی کا رہنے والا ایک عیار شخص تھا جو اپنے آپ کو صاحبِ کرامت بتلا کر لوگوں سے روپیہ ٹھگا کرتا تھا۔ آخر گرفتار ہوکر قیدخانہ میں مرگیا (مولف)

ہو کر یہ صداقت نہایت غضب اور قہر کے ساتھ دنیا پر ظاہر کر دیتی ہی
کہ جعلی ہنڈویاں جعلی ہی ہیں۔ غرض اس انسان اعظم (محمدؐ) کی نسبت
ہرگز یہ باور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ سچے نہ تھے"

سر سید احمد خاں صاحب مرحوم کا نوٹ جس کا حوالہ عبارت مندرجہ بالا میں دیا گیا ہی حسب ذیل ہی۔

"میں اس قدر اور زیادہ کرنا چاہتا ہوں کہ کروڑوں آدمی اس وقت
بھی اسی کلام پر مستحکم اعتقاد سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اور جن
ملکوں میں اسلامی سلطنت کبھی نہیں گئی اُن ملکوں کے لوگوں نے بھی اُن کی
باتیں سُن کر اُن کو قبول کر لیا۔ اور اب بھی کہ اُس کے بانی کو دنیا سے
گئے ہوئے بارہ سو برس گذر گئے ہر ایک ملک میں اور اُن ملکوں میں
بھی جہاں اسلامی سلطنت نہیں ہی۔ ہزاروں نئے لوگ اُس پر بغیر
کسی لالچ اور دھوکے کے اور بغیر کسی تدبیر کرنے والوں کی تدبیر و
حکمت کے ایمان لاتے جاتے ہیں اور اسلام قبول کرتے ہیں۔ تو کیا
وہ ایسا جھوٹا کھیل ہی جیسا کہ ایک بازی گر کا ہوتا ہی۔ نہیں بلکہ
اُس کے سچ ہونے کا ہر ایک کے دل پر یقین ہوتا ہی"

جس قدر شہادتیں اوپر مذکور ہوئیں ان کی اہمیت کا دارومدار شہادت دینے والوں کی فضیلت علمی یا اُن کی زبردست اور بلند پایہ شخصیتوں پر نہیں ہی بلکہ ان راوُں اور شہادتوں کی خصوصیت یہ ہی کہ وہ مشہور و معروف تاریخی واقعات اور ایسی مضبوط بدیہی عقلی دلائل پر مبنی ہیں کہ اُن کی صداقت کا کوئی معمولی سمجھ والا انسان انکار نہیں کرسکتا یہ کھلا ہوا تاریخی واقعہ ہی کہ جس وقت آنحضرت صلعم نے آوازہ نبوت بلند کیا تو اس آواز کی تائید کرنے والا کوئی دوسرا نہ تھا۔ عرب کا ذرّہ ذرّہ اس صدائے حق کا دشمن تھا۔ آپ پشت ہاپشت کی خوکردہ عادات کے ترک کی دعوت دیتے تھے۔ موروثی مذہب جو لوگوں کی رگ وپے میں سرایت کئے ہوئے تھا آپ اُس کی مذمت کرتے تھے جن بتوں اور دیوتاؤں کے رعب و ہیبت سے وہ کیا نپتے تھے آپ اُن کو منہدم کرنے کا حکم دیتے تھے۔ سرقہ۔ ڈاکہ۔ لوٹ مار۔ قتل و خونریزی۔ کینہ و عداوت۔ سود۔ قمار۔ بدکاری شراب۔ غرض وہ تمام افعال جو عرب کے خصایص بن گئے تھے اُن کا قلع قمع کرنا چاہتے تھے۔ علاوہ بریں آپ کے دست مبارک میں کوئی ظاہری مادی طاقت نہ تھی۔ دولت و خزانہ نہ تھا۔ اس دعوت کو قبول کرنے والوں کے لئے بجز مصائب اور بلاؤں کے آپ کے پاس کوئی ظاہری قابل معاوضہ چیز نہ تھی۔ ہر شخص کو معلوم تھا کہ اسلام کا نام لینے کے ساتھ وہ اپنے گھر سے

بیگانہ اپنی جائداد سے محروم۔ اپنے خاندان سے ناآشنا۔ اپنے وطن سے مہجور اور اکابر شہر اور رؤسا قریش میں رسوا اور بدنام اور ہر قسم کی مصیبتوں کا ہدف اور نشانہ بن جائے گا۔ غریب مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ بے رحمیاں اور سفاکیاں کی جا رہی تھیں وہ سب کے سامنے تھیں۔ باایں ہمہ ایک خلقت تھی کہ آستانۂ محمدی کی تلاش میں چلی آتی تھی عرب کے قبائل دور دور سے چھپ چھپ کر پہونچتے تھے اور بیعت کرکے واپس جاتے تھے اور آخر وہ لوگ بھی جو سالہا سال تک آنحضرت صلعم کے سخت دشمن تھے۔ اسلام کے شدید مخالف اور غزوات بدر و احد اور احزاب و خندق کے بانی تھے وہ بھی ایک روز سر اطاعت جھکانے پر مجبور ہو گئے۔ آخر اس کے کیا اسباب تھے۔ اور کیونکر اُن کو محمد رسول صلعم کی رسالت و صداقت کا یقین آیا۔ عیسائیوں کی طرح یہ کہنا آسان ہے کہ محمدؐ نے لڑکر لوگوں کو مطیع بنا لیا لیکن سوال یہ ہے کہ یہ ہزاروں جاں نثار لڑنے والے کہاں سے اور کیونکر پیدا ہو گئے اُن کو کس نے لڑکر مطیع بنایا۔

اس اپنے اور پرائے کے غمخوار کی دعوت صرف یہ تھی کہ لوگو لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کہو تو نجات پاؤ گے۔ اس دعوت سے باز رکھنے میں رؤسا قریش جب ہر قسم کی تدبیروں سے تھک گئے تو انھوں نے آپ کے

سامنے حکومت کا تخت زر و جواہر کا خزانہ اور حسن کی دولت پیش کی کیونکہ مشرکین اپنی کامیابی کے لیئے صرف ایک ہی ہتھیار استعمال نہ کرتے تھے بلکہ جب دیکھتے تھے کہ درشتی اور شدت سے مدعا حاصل نہیں ہوتا تو نرمی اور ملائمت کو کام میں لاتے تھے اور دوستی اور خیرخواہی کے لباس میں دشمنی کا اظہار کرتے تھے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ کفار قریش میں سے ایک شخص جو بڑا ذی وجاہت اور صاحبِ مال و منال تھا اپنے گروہ کے اشارہ سے آپ کے بہکانے کو آیا اور خلاف معمول نہایت ملائمت اور شیریں کلامی کے ساتھ بولا

ای فرزندِ برادر تم صاحبِ اوصاف جمیلہ اور عالی خاندان ہوکر کیا سبب ہے کہ ہمارے معبودوں کو بُرا بھلا کہتے ہو۔ اور اُن کی پرستش کی وجہ سے ہم کو احمق اور پاگل بتلاتے ہو اور ہماری قوم میں پھوٹ ڈال دینے کی کوشش کرتے ہو۔ کیا اس سے یہ مقصود ہے کہ کسی حسین وجمیل عالی خاندان عورت سے تمہاری شادی ہو جائے اگر یہی مُدعا ہے تو جس کو تم پسند کرو ہم اُس سے ابھی تمہارا نکاح کیئے دیتے ہیں اگر مال وزر مطلوب ہو تو اس قدر جمع کر دیتے ہیں کہ تم سب سے زیادہ دولتمند بن جاؤ۔ اور اگر حکومت و سرداری کی تمنا ہے تو تم کو اپنا سردار بلکہ بادشاہ بنالیتے ہیں۔ اور اُس طرح تمہاری اطاعت

اور فرماں برداری کریں گے جس طرح بادشاہوں کی کی جاتی ہو اور
اگر کسی جن بھوت کا سایہ ہوگیا ہو اور تم اُس کے دفعیہ سے عاجز ہو
تو کسی معالج کو لے آتے ہیں تاکہ تم کو تندرست کردے۔"

یہ کہکر وہ چپ ہوا تو آپ نے پوچھا کہ بس کہہ چکا جو کچھ تجھ کو کہنا تھا اُس نے کہا کہ ہاں آپ نے فرمایا بیٹھ جا اور سُن۔ اور قرآن مجید کی یہ آئتیں ارشاد کیں۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حٰمٓ ۝ تَنْزِیْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ کِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰیٰتُہٗ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا لِّقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ۝ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ...... غَیْرُ مَمْنُوْنٍ

یعنی یہ فرمان خدائے رحمٰن ورحیم کے حضور سے صادر ہوتا ہے۔ یہ قرآن کتاب ہو جس کی باتیں زبان عربی میں سمجھدار لوگوں کے لئے تفصیل کے ساتھ بیان کردی گئی ہیں۔ ماننے والوں کو خوشنودی خدا کی خوش خبری سُناتا اور منکروں کو عذاب خدا سے ڈراتا ہے۔ اس پر بھی ان میں سے اکثروں نے مُنہ موڑ لیا۔ اور وہ اس کو سنتے ہی نہیں۔ اور اے پیغمبر یہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ جس بات کی طرف تم ہم کو بلاتے ہو ہمارے دل تو اُس سے پردوں میں ہیں کہ تمہاری بات ہمارے کانوں میں ایک طرح کی گرانی ہو کہ تم جو کہتے ہو سُنائی نہیں دیتا۔ اور ہم میں اور تم میں ایک طرح کا پردہ حایل ہو کہ تم ہم پر کسی طرح کا اثر نہیں ڈال سکتے تو اس سے بہتر ہو کہ تم اپنے طور پر عمل

کیئے جاؤ ہم اپنے طور پر عمل کر رہے ہیں۔ اے پیغمبر تم ان لوگوں سے کہو کہ میں بھی تم ہی جیسا بشر ہوں مگر مجھ پر وحی آتی ہے کہ تمہارا معبود بس ہی ایک معبود ہے بس سیدھے اس کی طرف منہ کیئے چلے جاؤ اور اس سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو اور شرک کرنے والوں پر افسوس ہے۔ جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیئے ان کے لیئے آخرت میں بڑا اجر ہے جو کبھی موقوف ہونے والا نہیں) خلاصہ یہ کہ آپ نے اس مثنوی کی چکنی چپڑی باتوں پر بھی التفات نہ فرمایا اور وہ مایوس واپس چلا گیا۔ اس تدبیر کی ناکامی کے بعد مشرکوں نے مسلمانوں پر اور بھی زیادہ ظلم کرنے شروع کیئے۔ اور بالآخر وہ وقت آیا جب آخری ہمدم و دمساز یعنی آپ کے چچا ابوطالب نے بھی ساتھ چھوڑنا چاہا۔ جس کا جواب اولوالعزم رسول برحق کی زبان سے فقط یہ ملا کہ "چچا جان اگر قریش میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند رکھدیں تب بھی اپنے اعلان حق سے باز نہ آؤں گا"

نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیئے تھا یعنی بالآخر حق کامیاب ہوا لیکن کیا اس کامیابی سے داعی حق نے خود کوئی فائدہ حاصل کیا؟

مسجد نبوی کے صحن میں آپ کے سامنے مال غنیمت کے انبار لگ جاتے تھے مگر خود اس انبار کو تقسیم کرنے والے شاہ کونین کی زندگی یہ تھی کہ آپ کھال کی چٹائی یا خالی زمین پر آرام فرماتے تھے۔ کاشانۂ نبوت گو انوار الٰہی کا مظہر تھا

تاہم اس میں رات کو چراغ نہیں جلتا تھا کئی کئی دن فاقہ سے شکم مبارک پر دو دو تین تین پتھر بندھے ہوتے تھے۔ گھر کا کام کاج خود کرتے کپڑوں میں پیوند لگاتے گھر میں خود جھاڑو دیتے۔ دودھ دوہ لیتے۔ بازار سے سودا لاتے جوتی پھٹ جاتی تو خود گانٹھ لیتے اونٹ کو اپنے ہاتھ سے باندھ کر اس کو چارہ دیتے۔ غلام کے ساتھ مل کر آٹا گوندھتے۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّد۔

رسولِ خدا صلعم کی نبوت کو چار سال گزر چکنے کے بعد بھی مشرکین مکہ کی مخالفت میں کمی آنے کے بجائے اور زیادتی ہوگئی۔ وہ مسلمانوں کو سخت سے سخت تکلیفیں پہونچاتے تھے۔ آنحضرت صلعم نے تنگ آکر مسلمانوں کو ملک حبش میں پناہ لینے کی اجازت دی۔ وہاں کا بادشاہ نجاشی ایک نیک دل عیسائی تھا۔ دشمنوں نے وہاں بھی چین نہ لینے دیا اور اپنا ایک وفد نجاشی شاہ حبش کے پاس بھیجا۔ کہ ہمارے چند ناسمجھ آدمیوں نے اپنا آبائی دین ترک کرکے ایک نیا دین ایجاد کیا ہے۔ اور بھاگ کر آپ کے ملک میں پناہ لی ہے۔ آپ ان کو ہمارے حوالہ کر دیں۔ نجاشی نے مسلمانوں کو دربار میں طلب کیا حضرت جعفرؓ نے مسلمانوں کے نمائندہ کی حیثیت سے تمام واقعات بیان کیے اور پھر بادشاہ کے اس سوال پر کہ تم لوگ حضرت عیسےٰ کے متعلق کیا کہتے ہو سورۂ مریم

کی چند آیتیں پڑھ کر سنائیں جن کو سُن کر اُس کی دونوں آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور اُس نے مسلمانوں کو پناہ دی اور سردارانِ قریش کے حوالہ کرنے سے انکار کر دیا (یہ واقعہ کسی قدر تفصیل کے ساتھ تیسرے باب میں "قرآن مجید کی بے مثل تاثیر" کے زیر عنوان درج ہوا ہے) سفارت حبشہ کی ناکامی اور حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ کے اسلام قبول کرنے کی وجہ سے مشرکین عرب کے غیظ و غضب کی آگ اور بھی زیادہ بھڑک اُٹھی۔ چنانچہ اُنھوں نے جھلّا کر بنی ہاشم سے ترک موالات کر دی اور اُن کا مکمل بائیکاٹ کر دیا۔ بنی ہاشم نے پہاڑ میں پناہ لی اور تین برس تک سخت مصائب جھیلتے رہے اسی اثنا میں آپ کی بیوی خدیجہؓ اور آپ کے چچا ابو طالب کی وفات سے آنحضرتؐ پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا اور کفار مکہ کا ظلم و ستم بہت بڑھ گیا۔ اور آپ کو قطعاً مایوسی ہو گئی کہ اب یہ لوگ بت پرستی سے باز نہ آئیں گے آپ نے مایوس ہو کر اپنے غلام زید ابن حارث کے ساتھ متوکلاً علی اللہ شہر طائف کا قصد فرمایا تاکہ شاید قوم بنی ثقیف کو خدا تعالےٰ قبول اسلام کی توفیق دے اور وہ آپ کی حمایت و حفاظت پر آمادہ ہو جائے طائف مکہ سے مشرق کی طرف قریب ساٹھ میل کے ہے۔ اس تذکرہ کے سلسلہ میں سر ولیم میور اپنی کتاب "لائف آف محمد" میں لکھتے ہیں کہ

"محمد کے اس طائف کے سفر میں ایک نہایت اعلیٰ درجہ کی جانبازانہ

دلیری پائی جاتی ہے۔ ایک یکہ و تنہا شخص جس کو اس کی قوم کے
لوگوں نے بالکل چھوڑ دیا تھا اور اس کو نہایت حقارت کی نظر
سے دیکھتے تھے خدا کے نام پر دلیرانہ آگے بڑھا جس طرح حضرت
یونس نینیوا کو گئے تھے اور اس نے ایک بت پرست شہر کو
آگاہ کیا کہ توبہ کریں اور اس کی رسالت کی تائید کریں۔ اس
سے ایک نہایت قوی روشنی اس امر پر پڑتی ہے کہ اس کو اپنے
کام کے من اللہ ہونے کا کس شدت کے ساتھ یقین تھا"

مگر طائف کے لوگوں میں کسی کو توفیق قبول اسلام نہ ہوئی۔ بلکہ قریش کی طرح ان کو بھی طیش آگیا اور آنحضرت صلعم کو ایذائیں پہونچائیں۔ الحاصل آنحضرت تین یوم کے بعد واپس تشریف لے آئے۔

اس واقعہ کو سر ولیم میور صاحب نے اپنی کتاب "لائف آف محمد" (جلد چہارم صفحہ ۲۱۴-۲۱۵) میں اس طرح بیان کیا ہے:-

"پیغمبر عرب جس وقت طائف پہونچے بالکل تن تنہا اور بظاہر
بے یار و مددگار تھے۔ مگر ان کو پیام الٰہی پہونچانا تھا۔ چنانچہ
انھوں نے اہل طائف کو جمع کیا اور ہدایت کی کہ شرک سے باز
رہیں اور توبہ کریں۔ لوگوں نے ان کی تحقیر و تذلیل کی اور زخمی
کر ڈالا۔ اور تیسرے دن شہر سے نکال دیا۔ آپ کے زخموں سے

خون جاری تھا آپ نے شہر سے کچھ فاصلہ پر اللہ تعالیٰ کو اپنا دردِ
دل سُنایا۔ اور اپنے کام کا سلسلہ جاری رکھنے کے لیئے پھر مکہ واپس
آئے۔ جہاں اب ان کو کامیاب ہونے کی کوئی اُمید نہ تھی مگر اُن کو
انجام کار اپنی کامیابی کا پورا یقین تھا اور قادر مطلق پر بھروسہ تھا
جس کا وہ اپنے آپ کو رسول سمجھتے تھے۔ دُنیا کی تاریخ کے صفحات
میں اُن جانکاہ مصائب کے جانبازانہ مقابلہ کی نظیر ڈھونڈے
نہیں مل سکتی جو حد درجہ کے یاس انگیز حالات میں طرح طرح کی
ذلتوں اور دھمکیوں اور ایذاؤں کے باوجود مسلسل تیرہ برس تک
پیغمبر عرب سے ظہور میں آیا۔ اُن کے پائے استقلال میں سرمو
لغزش نہیں ہوئی وہ متواتر ناکامیوں کے باوجود برابر منکرینِ
مکہ کو راہ راست پر آنے اور توبہ کرنے کی ہدایت کرتے تھے
اور غضب الٰہی سے ڈراتے تھے۔ مگر وہ خود اور اُس کے مخلص فدا
مردوں اور عورتوں کا مختصر گروہ ہمیشہ تحقیر و تذلیل کا آماجگاہ
بنا رہا۔ اور ان کی جان ہر وقت خطرہ میں تھی۔ مگر ان لوگوں کو
اپنے مستقبل پر نہایت پختہ اعتماد اور اطمینان تھا۔ آخر کار جب
ایک دور دراز مقام سے کمک اور حفاظت کا وعدہ ہوا تو آپنے
سکون و اطمینان کے ساتھ اُس وقت تک انتظار کیا جب تک

آپ کے سب پیرو مکّہ سے روانہ ہو گئے جس کے بعد وہ خود بھی یکایک اپنے ناشکر گزار اور مفسد ہم وطنوں کو چھوڑ کر ترک وطن کر گئے"۔

"واشنگٹن ارونگ" امریکہ کے ایک نہایت زبردست ادیب مورخ اور واقعہ نگار ہیں جن کی تصنیفات انگلستان میں بھی بڑی وقعت کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں ۱۸۰۵ء میں آپ نے تمام یورپ کا دورہ کیا اور آپ متعدد کتابوں کے مصنّف ہیں۔ آپ نے اپنی مشہور و معروف کتاب "محمدؐ اور ان کے جانشین" میں لکھا ہے کہ

"ہم کو اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ جس ناپاک اور عظیم الشان فریب سے محمدؐ کو متہم کیا جاتا ہے اس سے ان کو آخر کیا نفع مقصود تھا۔ کیا دولت مقصود تھی؟ خدیجہؓ سے شادی کر کے وہ پہلے ہی دولتمند بن چکے تھے۔ اور اپنے "پُرفریب الہام" کے دعوے سے برسوں پیشتر انھوں نے اپنی دولت بڑھانے کا کوئی رُجحان ظاہر نہیں کیا۔ کیا شہرت مقصود تھی؟ وہ اپنے وطن میں پہلے ہی سے دانشمند اور متدین مشہور تھے وہ مشہور و معروف خاندان قریش کے اس شہرۂ آفاق شاخ کے فرد تھے جو سب سے زیادہ معزز سمجھی جاتی تھی۔ کیا وہ جاہ طلب تھے؟ کعبہ کی تولیت اور اس کے ساتھ

مقدس شہر مکہ کی حکومت پشت ہا پشت سے اُن کے خاندان میں چلی آتی تھی۔ اور گردوپیش کے حالات اور اپنے تعلقات کے لحاظ سے اس رتبہ پر جلد ہو پہنچ جانے کے وہ خود ہی مستحق تھے۔ اُن دیرینہ عقائد کو ملیا میٹ کرنے کی کوشش کرنے سے جن میں وہ خود پیدا ہوئے تھے اُنھوں نے مندرجہ بالا تمام توقعات کی خود ہی جڑ کاٹ دی تھی اُنھیں دیرینہ عقائد پر دولت اور اعزاز کا دارومدار تھا اُن پر حملہ کرنا مترادف تھا اپنے تمام عزیزوں دوستوں اور تمام ہم وطنوں کی مخالفت اور دشمنی مشتعل کرنے کا اور تمام اہل عرب کے دلوں میں جو کعبہ پرست تھے اپنی طرف سے نفرت اور عداوت پیدا کرنے کا۔ کیا آپ کی تبلیغ کے ابتدائی زمانہ میں کچھ ایسے توقعات پیش نظر تھیں جو اُن کی نفس کشی کا معاوضہ بن سکتیں اور اُن کو اپنا کام جاری رکھنے کی ترغیب دیتیں۔ مگر برخلاف کسی قسم کے خوش گوار حالات کے اُنھوں نے اپنا کام ناکامی کی فضا میں خفیہ طور پر شروع کیا۔ برسوں تک اُن کو کسی قسم کی کامیابی نہیں ہوئی۔ جوں جوں اُنھوں نے اپنے اصولوں کی علانیہ اشاعت کی اور اپنے الہامات کا اعلان کیا لوگوں نے اُن کے ساتھ تمسخر کرنا شروع کر دیا۔ اُن کی تحقیر و تذلیل پر کمر بستہ ہو گئے۔ اور آخر میں

اُن پر اور اُن کے دوستوں پر طرح طرح کے ظلم ہونے لگے یہاں تک کہ اُن کے بعض قریب عزیز اور رشتہ دار غیر ملک کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہوگئے اور اپنی حفاظت کی غرض سے خود اپنے وجود کو مخالفین کی نظروں سے اُن کو پوشیدہ کرنا پڑتا تھا۔ اور انجام کار اُن کو بھی لاچار اور عاجز ہو کر اپنا وطن چھوڑ کر ایک دور دراز غیر مقام میں پناہ لینی پڑی۔ آخر سالہا سال تک ایک ایسی پر فریب کاروائی پر اُن کو کیوں اصرار تھا جس نے اُن کی زندگی کے ہر قسم کے دنیاوی مفاد پر ایسی عمر میں پانی پھیر دیا تھا کہ اُس کے بعد پھر از سر نو اپنی کھوئی ہوئی خوش حالی کی بازیافت اُن کے لیئے بہت مشکل تھی"

مسٹر ٹامس کارلائل گویا اس کے جواب میں کہتے ہیں

نہیں صاحب۔ یہ عمیق القلب چمکدار سیاہ آنکھوں اور گہری روحانیت والا صحرائے عرب کا فرزند کچھ اور ہی خیالات اور نصب العین لیئے ہوئے تھا یہ ایک خاموش مگر عظیم الشان شخص تھا اور اُن لوگوں میں سے تھا کہ سوائے مخلص ہونے کے اُن کے لیئے کوئی چارہ کار ہی نہ تھا۔ خود قدرت نے اُن کو مخلص بنایا تھا۔ ہستی کا خوفناک مگر شاندار راز اُس پر منکشف ہو گیا تھا۔ اپنے اپنے سفر اور حضر میں ہزاروں خیالات اُن کے دل میں ہجوم تھا میں کیا ہوں؟ یہ چیز جس کی کچھ تھاہ نہیں اور

جس میں میں رہتا ہوں جس کو لوگ دنیا کہتے ہیں. کیا ہے؟ زندگی کیا ہے؟ موت کیا ہے؟ میں کس عقیدہ کو مانوں؟ میں کیا کروں؟ یہ ایسے سوالات تھے کہ ہیبت ناک کوہ حرا کی چٹان اور غار حرا کی ہولناک خاموشی اور تنہائی اور وہ بڑے بڑے اجرام فلکی جو خاموشی کے ساتھ نیلی اور روشن آسمانی فضا میں گردش کرتے رہتے ہیں ان کا جواب نہیں دے سکے۔ مدتوں ان سوالات کا کوئی جواب نہیں ملا. آخر خدا کے الہام نے عقدہ کشائی کی۔ اور آسمانی تائید کی بدولت محمدؐ نے جو نظام قایم کیا اُس کے نتائج دنیا نے دیکھ لیے۔"

مسٹر جان ڈیون پورٹ ایک بردست منصف مزاج انگریز مصنف اور مورخ جنھوں نے مسٹر گاڈفرے ہگنس کی طرح رسول خدا صلعم اور قرآن شریف کی تائید میں ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام "اپالوجی فار محمدؐ اینڈ دی قرآن" ہے. یہ کتاب پہلی بار ۱۸۶۹ء میں لندن میں چھپی تھی۔ اور پھر دوبارہ ۱۸۸۲ء میں چھپی اپنی اس کتاب میں آپ تحریر فرماتے ہیں کہ

"کیا یہ بات خیال میں آسکتی ہے کہ جس شخص نے اس نہایت ناپسندیدہ اور حقیر بت پرستی کے بدلے جس میں وہ اس کے ہم وطن (اہل عرب) مدت سے ڈوبے ہوئے تھے. خدائے واحد برحق کی پرستش قایم کرکے بڑی بڑی دایم الاثر اصلاحیں کیں مثلاً اولاد کشی موقوف کی نشہ کی

چیزوں کے استعمال کو، اور قماربازی کو جس سے اخلاق کو بہت نقصان پہونچتا ہے منع کیا۔ کثرتِ ازدواج کا اُس وقت بہت زیادہ رواج تھا اُس کو بہت کچھ گھٹا کر محدود کیا۔ غرض کیا ایسے بڑے سرگرم مصلح کو ہم فریبی ٹھہرا سکتے ہیں۔ اور یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایسے شخص کی تمام کارروائی مکر پر مبنی تھی نہیں ہرگز ایسا نہیں کہہ سکتے۔ بیشک محمدؐ بجز دلی نیک نیتی اور ایمانداری کے اور کسی سبب سے ایسے استقلال کے ساتھ اپنی کارروائی پر ابتداء نزول وحی سے جو خدیجہؓ سے بیان کی آخر دم تک۔ جبکہ عائشہؓ کی گود میں شدت مرض سے وفات پائی۔ مستعد نہیں رہ سکتے تھے۔ جو لوگ ہر وقت اُن کے پاس رہتے تھے اور جو اُن سے بہت ربط و ضبط رکھتے تھے اُن کو بھی کبھی اُن کی ریاکاری کا شبہ نہیں ہوا۔ اور کبھی اُنھوں نے اپنے نیک برتاؤ سے تجاوز نہیں کیا۔ بیشک ایک نیک اور صادق طبیعت شخص جس کو اپنے خالق پر بھروسہ ہوا اور جو ایمان اور رسم و رواج میں بہت بڑی اصلاح کرے حقیقت میں صاف صاف خدا کا آلہ ہوتا ہے اُس کو ہم کہہ سکتے ہیں کہ خدا کا پیغمبر ہے جس طرح خدا تعالیٰ کے اور وفادار خادم گزرے ہیں اگرچہ اُن کی خدمتیں کامل نہ تھیں اُسی طرح محمدؐ کو بھی خدا کا ایک سچا خادم کیوں نہ سمجھیں جس نے

خدا تعالیٰ کی خدمت ایسی ہی وفاداری سے کی جیسی ورڈن نے کی اور جو مثل اوروں کے پوری اور کامل[۱] نہ تھی اس بات پر کیوں یقین نہ کیا جاوے کہ اُس کو اپنے زمانہ اور اپنے ملک میں اپنی قوم کو خدا کی وحدانیت اور تعظیم سکھلانے کے لیئے اور ان کی حالت کے مناسب اُن کو ملکی اور اخلاقی اُمور میں نصیحت کرنے کے لیئے خدا نے بھیجا تھا۔ اور وہ راست بازی اور نیک کرداری کا واعظ تھا۔"

اکتوبر ۱۸۸۱ء کے رسالہ کوارٹرلی ریویو (لندن) میں اسلام پر ایک آرٹیکل چھپا تھا جو زبان عبرانی کے ایک مشہور عالم نے لکھا تھا۔ اس میں آنحضرتؐ کے متعلق تحریر تھا کہ

"تمام عمر اُن کو بڑے بڑے خطرے اور تکلیفیں پیش آئیں اُن سب کو اُنھوں نے کمال صبر و استقلال کے ساتھ برداشت کیا۔ اُنھوں نے خدائے واحد کی پرستش اور عبادت کی تجدید ایسے طور پر کی جس کی کوئی نظیر و مثال نہیں پائی جاتی۔ اور علم الٰہیات کو ایسے پختہ اور معقول اصول پر قائم کیا جن کا ہمسر معدوم ہو۔ اُنھوں نے قوانین تمدن و اخلاق کو ایسا کمال پر پہونچایا جو اُس سے پیشتر کبھی نہیں ہوا تھا۔ اُنھیں کی

[۱] مسٹر جان ڈیون پورٹ عیسائی مذہب کے عالم تھے۔ یہ جملہ اپنے ذاتی مذہب کی ساتھ حسن عقیدت پر مبنی ہے۔ مولف۔

وساطت سے انسانوں کی بہبودی اور رفاہ کے واسطے وہ مُلکی و
مالی۔ دینی اور دنیوی قوانین کا مجموعہ حاصل ہوا جو اپنی نوع میں یکتا
اور بے نظیر ہے۔ آنحضرتؐ ہی وہ شخص ہیں جنہوں نے اپنی زندگی میں تمام
جزیرۂ عرب کو فتح کر لیا اور مختلف قبیلوں کو مجتمع کر کے ایک مضبوط
اور طاقتور اور عظیم الشان قوم بنا دیا جس نے اُس زمانہ کی مہذب
دنیا کے ایک جزو اعظم کو عرصہ قلیل میں مفتوح و مسخر کر لیا۔ کیا اس بات
کا خیال کرنا قرین عقل و انصاف ہے کہ ایسے کارہائے نمایاں ایک
لاچار اور ناتواں مصروع شخص سے عمل میں آئے ہوں گے ایسے کارہائے
نمایاں کا عمل میں آنا بجز اُس شخص کے جس کے قوائے روحانی اور
جسمانی کامل اور صحیح ہوں اور کسی شخص سے ناممکن معلوم ہوتا ہے اور
اُس کی ماہیت تائید ربانی پر دلالت کرتی ہے۔"

قیصر روم کے دربار میں جس وقت قاصد نبوی نامہ مبارک لیکر پہنچا ہے تو اس نے
ابوسفیان کو جنہوں نے اس وقت تک دین اسلام قبول نہیں کیا تھا اور رسول
خدا صلعم کے سخت دشمن تھے اور اتفاق سے اُن دنوں وہاں موجود تھے اپنے

---

* آنحضرت صلعم پر نزول وحی کے وقت جو حالت طاری ہوتی تھی متعصب عیسائی پادریوں نے اس کو
اپنی تصانیف میں از راہ تعصب مرض صرع (مرگی) سے تعبیر کیا ہے۔ مولف

دربار میں بلوایا اور سر دربار قیصر روم اور ابوسفیان کے درمیان حسب ذیل گفتگو ہوئی:-

قیصر	ابوسفیان
مدعی نبوت کا خاندان کیسا ہے؟	نہایت شریف اور معزز
" اس خاندان میں کسی اور نے نبوت کا دعویٰ کیا؟	" نہیں
" اس خاندان میں کوئی اور بادشاہ گزرا ہے؟	" نہیں
" جن لوگوں نے اس کے مذہب کو قبول کیا وہ امیر ہیں یا غریب؟	" زیادہ تر غریب نادار لوگ
" اُس کے پیرو بڑھ رہے ہیں یا گھٹتے جاتے ہیں؟	" تیزی کے ساتھ بڑھ رہے ہیں
" جو لوگ اُس پر ایکبار ایمان لائے کیا اُن میں سے آگے چل کر کسی نے اُس کا ساتھ چھوڑا؟	" ایسا کبھی نہیں ہوا
" دعوائے نبوت سے قبل اُس کے چال چلن کی نسبت تمھارا کیا خیال ہے؟	" ہم سب اُس کی نسبت بہت اعلیٰ رائے رکھتے تھے اور وہ ساری قوم میں بالاتفاق "الامین" تسلیم کیا جاتا تھا
" کبھی تم لوگوں کو اُس کی نسبت جھوٹ بولنے کا کبھی تجربہ ہوا ہے؟	" کبھی نہیں۔
" اُس نے جنگ میں کبھی اپنے عہد پیمان کی خلاف ورزی کی ہے؟	" آج تک کبھی نہیں۔

قیصر۔ تم لوگوں نے اُس سے جنگ کی ہے؟ **ابوسفیان**۔ ہاں۔

" نتیجہ جنگ کیا رہا؟ " کبھی وہ غالب رہا کبھی ہم ایک بار ہم نے اُس کو شکست بھی دی

" وہ کیا سکھاتا ہے؟ " کہتا ہے کہ ایک خدا کی عبادت کرو کسی اور کو خدا کا شریک نہ بناؤ۔ نماز پڑھو پاکیزگی اختیار کرو۔ سچ بولو بدی سے بچو۔

یہ گفتگو ختم ہونے پر قیصر نے کہا کہ تم نے اُس کو شریف النسب بتایا پیغمبر ہمیشہ اچھے خاندان سے پیدا ہوتے ہیں۔ تم نے کہا کہ اُس کے خاندان میں کسی اور نے نبوت کا دعوےٰ نہیں کیا اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھتا کہ یہ خاندانی خیال کا اثر ہے۔ تم تسلیم کرتے ہو کہ اس خاندان میں کوئی بادشاہ نہ تھا اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھتا کہ اُس کو بادشاہت کی ہوس ہے۔ تم مانتے ہو کہ اُس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ جو شخص آدمیوں سے جھوٹ نہیں بولتا وہ خدا پر کیوں کر جھوٹ باندھ سکتا ہے۔ تم کہتے ہو کہ کمزوروں نے اُس کی پیروی کی ہے۔ پیغمبروں کے ابتدائی پیرو ہمیشہ غریب لوگ ہی ہوتے ہیں۔ تم نے تسلیم کیا کہ اُس کا مذہب ترقی کرتا جاتا ہے۔ سچے مذہب کا یہی حال ہے کہ وہ بڑھتا ہے۔

تم تسلیم کرتے ہو کہ اس نے کبھی فریب نہیں دیا، پیغمبر کبھی فریب نہیں دیتے
تم کہتے ہو کہ وہ نماز و تقویٰ اور عفاف کی ہدایت کرتا ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو وہ
یقیناً پیغمبر ہے"

ایک صاحب نے حال میں بمقام لکھنؤ مؤلف سے روایت بیان کی
کہ ۲۱-۱۹۲۰ء کے دوران میں جبکہ تحریک نان کوآپریشن (ترک موالات) ملک
میں زور شور سے جاری تھی اور ہندو مسلمانوں میں اتفاق و اتحاد کا بہت کچھ
چرچا تھا مہاتما گاندھی جی نے اجودھیا کے مقام پر اپنی ایک تقریر کے سلسلہ
میں بیان کیا تھا کہ جس زمانہ میں وہ قرآن شریف کے مطالعہ میں مصروف
تھے تو سورہ الم نشرح کی اس آیت کا مفہوم اچھی طرح نہیں سمجھ سکے۔
وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ (ترجمہ۔ اور ہم نے آپ کی خاطر آپ کے
ذکر کا آوازہ بلند کیا) بعض علما نے جو مطلب سمجھایا اس سے اس آیت کی اہمیت
سمجھ میں نہیں آسکی۔ حسن اتفاق سے جناب شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب
دیوبندی سے ملاقات ہوئی تو دریافت کرنے پر آپ نے آسانی سے
اس کا مطلب ذہن نشین کر دیا۔ یعنی آپ نے مجھ سے (مہاتما جی سے) پوچھا
کہ کیا دنیا میں کوئی ملک ایسا ہے جہاں مسلمان نہ ہوں۔ میں نے جواب دیا "نہیں"
اس پر فرمایا کہ جہاں جہاں مسلمان ہیں وہاں کم سے کم ایک مسجد کا وجود ضروری ہے

اور ہر مسجد میں پانچوں وقت موذن بہ آواز بلند خدا کی توحید کے ساتھ آنحضرت صلعم کی رسالت کی صداقت کا اعلان کرتا ہے۔ اور جس طرح کہا جاتا ہے کہ انگریزوں کی سلطنت میں آفتاب کبھی غروب نہیں ہوتا یعنی اس سلطنت کے کسی نہ کسی حصہ پر آفتاب ہر وقت روشن رہتا ہے اسی طرح شرقاً غرباً فاصلہ (طول البلد) کے لحاظ سے دنیا کے مختلف مقامات میں ہر وقت کسی نہ کسی نماز کا وقت ہوتا ہے۔ لہذا دنیا کے کسی نہ کسی گوشہ میں ہر وقت آنحضرت صلعم کا نام مبارک پکارا جاتا ہے کیا دنیا میں ایسا بے نظیر امتیاز کسی اور بشر کو آج تک نصیب ہوا ہے کہ اس کا ذکر اور اس کی رسالت کی تصدیق ہر روز پانچوں وقت دنیا کے ہر گوشہ میں اس طرح بہ آواز بلند کی جاتی ہو۔ کیا دنیا کی بڑی سے بڑی سلطنت کے اثر سے کسی بڑے سے بڑے بادشاہ کے نام کو یہ عظمت نصیب ہوئی ہے۔ یا ہو سکتی ہے؟ دنیا میں آنحضرت صلعم کے نام مبارک کا یہ چرچا اگر تائید الٰہی کا نتیجہ نہیں ہے تو آخر کس طاقت اور اثر کا نتیجہ ہے۔ یہ واقعہ تو بظاہر معمولی معلوم ہوتا ہے مگر اپنی ندرت اور خرق العادت ہونے کے لحاظ سے تنہا یہی واقعہ آنحضرت صلعم کی صداقت کا کافی ثبوت ہے ؎

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ مے نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا است

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰٓى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ ٥

دوسرا باب

کلام الٰہی کی بے نظیر فصاحت و بلاغت

تمام مسلمانوں کا یہ مستحکم عقیدہ ہے کہ قرآن مجید رسول خدا حضرت محمد صلعم کا زندہ جاوید معجزہ ہے لیکن اختلاف اس میں ہے کہ وہ کس حیثیت سے معجزہ ہے اور وجہ اعجاز کیا ہے؟ بعض علماء قرآن مجید کی نہایت صاف اور شستہ اور دل پر اثر کرنے والی اور چھانے والی فصاحت و بلاغت کو اس کا معجزہ قرار دیتے ہیں۔ اور اعجاز یہ ہے کہ اس کی فوق العادت تاثیر سے قلوب انسانی مسخر ہوگئے اور اللہ تعالےٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے تمام فصحا و بلغاء عرب و عجم کی زبانیں اس کے مقابلہ میں گنگ کر دیں اور وہ اس کا جواب نہیں لا سکے۔ بعض کا قول ہے کہ وجہ اعجاز یہ ہے کہ ایک امّی کی زبان سے ایسا کلام بلاغت نظام نکلا بعض متکلمین کے نزدیک وجہ اعجاز قرآن مجید کا اظہار غیب اور اس کی پیشین گوئیاں ہیں جو انسان کے حیطۂ امکان سے باہر ہیں۔ اور بعض علماء نے یہ خیال کیا ہے کہ قرآن مجید کا اصلی اعجاز اس کی وہ بے نظیر تعلیم و ہدایت ہے جس نے دنیا کی کایا پلٹ کر دی اور بنی آدم کی روحانی اور اخلاقی تعلیم و تربیت اور اصلاح و ترقی تمدّن کے لحاظ سے ربّانی کرشمے دکھلائے جن کی بدولت

ایسے ایسے وسیع الاثر حقانی نتائج ظہور میں آئے جنھوں نے عالم کو محو حیرت کر دیا اور آج تک کر رکھا ہے۔ متکلمین نے قرآن مجید کے اعجاز کے ان مختلف پہلوؤں کو اختلاف رائے سے تعبیر کیا ہے۔ مگر جیسا کہ آئندہ صفحات سے ظاہر ہوگا قرآن مجید اپنی مذکورہ بالا ہر ہر خصوصیت کے لحاظ سے معجزہ ہے ؎

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ مے نگرم
کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست

حسن بہت سی اداؤں کے مجموعہ کا نام ہوتا ہے مگر اس مجموعہ کی ہر وہ ادا جو کسی اہل نظر کے حق میں جاذب نظر اور جاذب توجہ ثابت ہو اس کے نزدیک بجائے خود حسن ہے کسی کو گلاب کے پھول کی صورت پسند ہے کوئی اس کی پنکھڑیوں کی نزاکت سے متاثر ہوتا ہے۔ کوئی اس کی خوشبو کا شیدا ہے کوئی اس کی طبی تاثیر کا قدر شناس ہے۔ کوئی اس کی پتیوں کی معین شمار و ترتیب میں صانع ازلی کی صنعت مشاہدہ کر کے وجد کرتا ہے۔ اسی طرح قرآن مجید سراپا معجزۂ کامل ہے اور جن تفصیلات کا اوپر ذکر ہوا اُن میں سے ہر ایک بجائے خود وجہ اعجاز ہے۔ ؎

اے ترا با ہر دلے رازے دگر ہر گدا را بر درت نازے دگر

جس کلام کو کلامِ الٰہی کہا جائے اُس کے جانچنے اور پرکھنے کا یہی باب طریقہ ہے کہ دیکھا جائے کہ انسان سے اس قسم کا کلام صادر ہونا ممکن ہے یا نہیں

اگر انسان سے اُس جیسا کلام ظہور میں آنا ممکن ہو تو سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ کلام الٰہی ہی۔

قرآن مجید کی سب سے بڑی اور سب سے نرالی خصوصیت جو اُس کو اور تمام آسمانی کتابوں سے ممتاز کرتی ہی یہ ہی کہ اُس کا نہایت شد و مد سے یہ دعویٰ ہی کہ وہ خدا کا کلام ہی۔ لہذا بے مثل اور بے مانند ہی۔

۱۔ چنانچہ سورۂ ھود میں ارشاد ہوتا ہی۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝

(یعنی کیا کافر قرآن کو کہتے ہیں کہ یوں ہی بنا لیا ہی تو ای پیغمبر اُن سے کہدو کہ اگر تم سچے ہو تو اُس کی دس سورتوں ہی کی مانند تم بھی یوں ہی بنا لاؤ۔ اور خدا کے سوا جس کو بُلا سکتے ہو مدد کے لیئے بُلا لو۔ رکوع ۲)

۲۔ پھر سورۂ طور میں ارشاد ہوتا ہی۔ اَمْ يَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ ۚ بَلْ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۚ فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ۝

(یعنی کہتے ہیں کہ اس شخص نے قرآن از خود بنا لیا ہی (مگر یہ ان کا اپنا کہنا ہی بلکہ (اصل بات یہ ہی کہ) یہ ایمان ہی لانا نہیں چاہتے۔ اگر یہ اپنے دعوے میں سچے ہیں تو اسی طرح کا کلام یہ بھی بنا کر لائیں۔ رکوع ۲)

۳۔ سورۂ بنی اسرائیل میں اس سے بھی بڑھ کر یوں ارشاد ہوتا ہی۔ قُلْ لَّئِنِ

اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَ لَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا ۝

یعنی اے پیغمبر ان سے یہ کہہ دے کہ اگر جن اور انسان اس بات پر متفق ہو کر اس قرآن کی مثل بنا لیں تو اس کی مانند نہ لاسکیں گے اگرچہ ایک دوسرے کے مددگار بھی ہوں۔ (رکوع ۱۰)

۴۔ پھر سورہ یونس میں اس پر یوں فرمان صادر ہوتا ہے اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَ ادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝

یعنی کیا کافر قرآن کی نسبت کہتے ہیں کہ یوں ہی بنا لیا ہے تو اے پیغمبر ان سے کہہ دو کہ اگر تم سچے ہو تو اس کے ایک ٹکڑے ہی کی مانند تم بھی لاؤ اور خدا کے سوا جس کو مدد کے لیے بلا سکتے ہو بلا لو۔ (رکوع ۴)

۵۔ سورہ بقرہ میں نہایت صاف اعلان فرما دیا گیا ہے کہ منکرین ہرگز قرآن مجید کی ایک سورۃ کے مانند بھی کوئی کلام پیش نہ کر سکیں گے۔

وَ اِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ۪ وَ ادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَ لَنْ تَفْعَلُوْا

(یعنی اور وہ جو ہم نے اپنے بندے (محمدؐ) پر قرآن اتارا ہے اگر تم کو

اُن میں شک ہو کہ یہ کتاب خدا کی نہیں بلکہ آدمی کی بنائی ہوئی ہے اور اپنے دعوے میں سچے ہو تو اس جیسی ایک سورہ تم بھی بنا لاؤ۔ اور اللہ کے سوا اپنے حمایتیوں کو بھی بُلا لو۔ پس اگر (اتنی سی بات بھی) نہ کر سکو اور ہرگز نہ کر سکو گے۔ الخ (رکوع ۳)

یہ کیسا عجیب و غریب ماجرا ہے کہ جب سے دُنیا قائم ہوئی ہے کسی کتاب نے آج تک اپنے بے مثل اور بے مانند ہونے کا عظیم الشّان دعوے ایسے صاف صاف اور کھلے کھلے الفاظ میں نہیں کیا۔ اور پھر یہی نہیں کہ پوری کتاب کی مانند دوسری کتاب تیار کر دینے کا مطالبہ ہو۔ بلکہ تمام فصحائے عرب و عجم کو چیلنج (تحدّی) دیا گیا تھا کہ ساری کتاب کے مانند دوسری کتاب بنانا تو رہا ایک طرف قرآن مجید کی ایک سورۃ کی مانند ہی بنا لاؤ۔ اور یہ ظاہر ہے کہ قرآن مجید کی بعض سورتیں مثلاً سورۂ کوثر اور سورۂ اخلاص صرف تین تین آیتوں کی سورتیں ہیں جو ایک ایک سطر میں لکھی جا سکتی ہیں۔ لہٰذا دوسرے الفاظ میں ساری دنیا کو للکارا گیا تھا کہ اگر تم کو قرآن مجید کے کلام الٰہی ہونے میں شک ہے تو اس جیسی ایک سطر ہی بنا لاؤ۔

یہ آیات شریف جن میں کلام مجید کے بے مثل ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہے سب مکہ میں نازل ہوئیں۔ جبکہ مسلمانوں کی تعداد بہت قلیل تھی۔ اور وہ اپنے اہل وطن کے مظالم کا شکار بنے ہوئے تھے۔ اور گوناگوں مصائب میں مبتلا تھے

لہذا یہ چیلنج کسی مساوی رتبہ کے فریق کو نہیں دیا گیا۔ بلکہ ایک مظلوم گروہ کی طرف سے سارے ملک کو دیا گیا تھا جو اُن کی مخالفت پہ تلا ہوا تھا۔

چونکہ زمانہ نزول قرآن میں اہل عرب کو اپنی فصاحت و بلاغت کا بڑا ہی دعوے تھا۔ شعر موزوں کر دینا اُن کے نزدیک ایک معمولی بات تھی لونڈیاں تک مختلف مضامین میں ایسے برجستہ اشعار کہہ دیا کرتی تھیں کہ آج اچھے سے اچھا ادیب اُن کی مثل نہیں کہہ سکتا۔ تو ایک اَن پڑھ پیغمبر کا ان لوگوں سے پکار پکار کر یہ کہنا کہ اس طرح کی ایک ہی سورۃ بنالاؤ غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ لہذا تقریباً تمام علما اور مفسرین کی یہ رائے ہے کہ خدا نے قرآن کے من اللہ ثابت کرنے کو یہ معجزہ قرار دیا ہے کہ ویسا فصیح و بلیغ کلام کوئی بشر نہیں کہہ سکتا۔ چنانچہ آج تک کوئی نہیں کہہ سکا پیغمبر خدا صلعم کے زمانہ کا کوئی واقعہ ایسا نہیں جو قلمبند نہ ہوا ہو۔ بعثت سے قبل اور بعد آنحضرت ؐ کے موافق اور مخالف ہر ہر بات کتب احادیث و سیر میں پوری تفصیل کے ساتھ مذکور ہے اگر کسی نے کلام مجید کے اس چیلنج کو قبول کر کے اس کے مقابلہ میں کبھی کوئی کلام پیش کیا ہوتا تو یہ ناممکن تھا کہ وہ آج تک صینہ راز میں رہتا اور اس کا کہیں مذکور نہ ہوتا۔ بلکہ مشرکین مکہ نے تو جو آنحضرت صلعم کی تکذیب اور توہین و تذلیل میں اپنی طرف سے کوئی کسر نہ اُٹھا رکھتے تھے اس

بشری کلام کی نشر و اشاعت میں چوٹی سے ایڑی تک کا زور لگا دیا ہوتا۔ مکہ اور مدینہ میں قریش اور دیگر مشرکین عرب کے علاوہ بے شمار عیسائی اور یہودی آباد تھے جن کے غیر ممالک سے تعلقات تھے۔ اور جو رسول خدا صلعم سے بغض و عداوت رکھتے تھے۔ اگر قرآن مجید کے اس دعوے کی تردید میں کبھی کوئی کلام پیش ہوا تھا تو اس قسم کے زبردست مخالفین کی موجودگی میں ایسے اہم واقعہ کا اخفا نا ممکن تھا۔ غرض ساڑھے تیرہ سو برس گزر گئے کہ کوہ صفا کی چٹان پر کھڑے ہو کر ایک اُمّی نے دُنیا سے ایک بار نہیں۔ دو بار نہیں بلکہ کئی بار تحدی کی تھی کہ وہ اس کلام کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے ہی کی مانند کلام پیش کرے۔ تو کیا یہ معجزہ نہیں کہ ان تیرہ صدیوں کا ایک ایک سال گزر گیا مگر ایک آواز بھی اس تحدی کے قبول کرنے کے لیئے بلند نہیں ہوئی۔ کیا یہ امر واقعہ نہیں ہی کہ عین اُس وقت جب ایک اُمی کی طرف سے جو ایک شعر تک موزوں نہیں پڑھ سکتا تھا۔ یہ مدعیانہ اعلان عرب میں شایع ہوا۔ اُس وقت عرب کے قبیلہ قبیلہ میں بڑے بڑے زبان آور شعرا اور آتش بیان خطبا موجود تھے۔ مگر اس صوت سرمدی کے سامنے سب کی زبانیں گنگ ہو گئیں۔

کفار عرب نے اسلام اور پیغمبر اسلام کی تکذیب کی کیا کیا کوششیں نہ کیں۔ اُنھوں نے ان کوششوں کے سلسلہ میں جان و مال قربان کیا۔

اپنے عزیزوں اور فرزندوں کو شدید مخالفت پر اُبھارا۔ اپنی جانیں ہتھیلیوں پر رکھیں۔ اُن کے سپاہیوں نے میدان جنگ میں پرے جمائے۔ اُن کے دولتمندوں نے اپنے خزانے کھول دیئے۔ اُن کے شاعروں اور خطیبوں نے اپنی آتش بیانیوں سے رسول خدا صلعم کی مخالفت پر تمام قبائل عرب کو بھڑکا دیا۔ یہ سب کچھ کیا مگر اُن سے یہ نہ ہو سکا کہ قرآن مجید کی ایک سورۃ کا جواب پیش کر سکیں جو اسلام کے دعوائے صداقت کے مستحکم قلعہ کو چشم زدن میں مسمار کر دیتا۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اس کی مثال لانے سے عاجز رہے۔

قرآن مجید کی جو آیتیں اوپر درج ہو چکی ہیں۔ چونکہ اُن میں کوئی ایسا لفظ نہیں ہی جس سے قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت وجہ اعجاز قرار دی گئی ہو اس لیئے سر سید احمد خاں صاحب مرحوم اور اُن کے ہم خیال محققین کی یہ رائے ہی کہ کسی کلام کا بے نظیر ہونا اس بات کی تو بے شبہ دلیل ہی کہ اُس کی مانند کوئی دوسرا کلام نہیں۔ مگر اس کی دلیل نہیں ہی کہ وہ خدا کی طرف سے ہی کیونکہ بہت سے کلام انسانوں کے دنیا میں ایسے موجود ہیں کہ اُن کی مثل فصاحت و بلاغت میں آج تک دوسرا کلام نہیں ہی۔ مگر وہ من اللہ تسلیم نہیں ہوتے۔ جب انسانوں کے کلام بے نظیر موجود ہیں اور وہ من اللہ تسلیم نہیں ہوتے تو پھر قرآن مجید میں ایسی کیا خصوصیت ہی کہ اُس کا بے مثل اور بے مانند ہونا من اللہ ہونے کی دلیل قرار دی جائے۔ اس

بنا پر سرسید مرحوم اور اُن کے ہم خیال لوگوں کی رائے ہے کہ مذکورہ بالا آیتوں میں جو تحدی ہے اُس کا یہ منشا ہے کہ اگر قرآن کے من اللہ ہونے میں شبہ ہو تو کوئی ایک سورۃ ایسی بنا لاؤ جو قرآن جیسی ہادی اور رہنما ہو۔

سرسید احمد خاں صاحب مرحوم نے اپنے قول کی تائید میں کسی ایسے انسانی کلام کا نام نہیں بتلایا جس کی مثل فصاحت و بلاغت میں آج تک دوسرا کلام نہ ہوا ہو۔ ورنہ اُس کلام کی نسبت غور ہو سکتا کہ آیا حقیقت میں اس کو دُنیا نے لاثانی تسلیم بھی کیا ہے یا یہ محض سرسید مرحوم کی ذاتی رائے تھی۔ البتہ انگلستان کے مشہور مورخ ایڈورڈ گبن نے ذیل کے الفاظ میں یہ اعتراض کیا ہے کہ اگر قرآن مجید کی تحریر استعداد انسانی سے متجاوز ہے تو ہومر کی ایلیڈ اور ڈیماستھنیز کی فلپکس کو کس برتر عقل کی طرف منسوب کرنا چاہیئے؟

ہر قوم فطرتاً اپنے شاعر کو سب سے زیادہ بلند مرتبہ پر دیکھنا پسند کرتی ہے۔ زمانہ قدیم کے بڑے بڑے لوگوں کی سوانح عمریوں اور تذکروں کی کوئی انگریزی کتاب اُٹھا کر دیکھ لیجئے۔ جو تعریف یونان کے مشہور شاعر ہومر کی کتاب الیڈ کی درج ہے وہی تعریف اٹلی کے مشہور شاعر ورجل کی کتاب اینیڈ کی آپ لکھی پائیں گے۔ انگلستان کے شاعر ڈرائڈن نے اپنی ایک نظم میں انگلستان کے مشہور شاعر ملٹن کو ہومر اور ورجل دونوں شاعروں پر ترجیح دی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ تین شاعر تین مختلف زمانوں میں پیدا ہوئے۔ ہومر

خیالات کی بلند پروازی میں اپنا نظیر نہ رکھتا تھا۔ اور ورجل شوکت الفاظ اور اسلوب بیان میں لاثانی تھا اور ملٹن ان دونوں شاعروں کے وصف بدرجہ کمال اپنے میں رکھتا تھا۔

ہومر کی ایلیڈ کے متعلق ایک طرف گبن کی رائے ہے۔ دوسری طرف ڈرائڈن کی رائے ہے۔ دونوں انگلستان کے باشندے ہیں۔ مگر ڈرائڈن شاعر ہے لہذا بمقابلہ گبن کے شعرا کے کلام جانچنے کا زیادہ اہل ہے۔ ایسی حالت میں ان تین شاعروں میں سے کسی ایک کے کلام کو استعداد انسانی سے متجاوز قرار دینا ایک ایسے مورخ کی شخصی رائے ہے جو خود شاعر نہیں۔ اہل فارس کو حق ہے کہ وہ فردوسی کے شاہنامہ اور نظامی کے سکندرنامے سعدی کی گلستاں۔ اور مولانا روم کی مثنوی کو ہومر کی ایلیڈ کی طرح لاجواب سمجھیں۔ معلوم نہیں ایڈورڈ گبن نے شیکسپیر کے مقبول عام کلام کو اس موقعہ پر مثال کے طور پر کیوں پیش نہیں کیا۔ رہ گئیں ڈیماستھینز کی فلپکس۔ ڈیماستھینز یونان کے مشہور شہر اتھینز کے فصحا میں البتہ بلند مرتبہ رکھتا تھا۔ فلپکس اس کی وہ فصیح و بلیغ تقریریں کہلاتی ہیں۔ جو اس نے فلپ شاہ مقدونیہ کے خلاف اپنے ہم وطنوں کے جذبات برانگیختہ کرنے کے لیئے اپنے ملک میں کیں۔ اگر ڈیماستھینز کی یہ تقریریں محیر العقول قرار دی جائیں تو پھر بے شمار عرب فصحا و بلغا کی نسبت ایڈورڈ گبن کیا رائے

قایم کریں گے جنھوں نے اپنی زبان کو ایسی ترقی دی تھی اور فصاحت و بلاغت میں وہ کمال بہم پہونچایا تھا کہ ایک ایک فصیح صاحب تقریر جو خطیب کہلاتا تھا قبیلوں کے قبیلوں کو فقط اپنے کلام کے زور سے جس ارادہ سے چاہتا روک لیتا۔ اور جدھر چاہتا جھونک دیتا۔ اور اُن کو اپنی فصاحت وبلاغت اور اپنی زبان آوری اور آتش بیانی پر اس قدر ناز تھا کہ اپنے مقابلہ میں وہ ساری دُنیا کو عجم یعنی گونگا کہتے تھے۔

خیر یہ تو سب پرانے قصّے ہیں۔ حال میں چند سال کا عرصہ ہوا ہندوستان جیسے وسیع ملک میں مہاتما گاندھی کی تحریک ترک موالات اور کسانوں میں پنڈت جواہرلال نہرو کی لگان نہ ادا کرنے کی تحریک کے سلسلے میں ان سیاسی لیڈروں کی تقریروں اور تحریروں نے برطانیہ جیسی زبردست اور عظیم الشان سلطنت کے مقابلہ میں جو اثرات پیدا کیئے اُن کے مقابلہ میں "دیماستھینز کی فلپکس" کی کیا حقیقت ہے۔ لہذا سرسید احمد خاں صاحب مرحوم اور ایڈورڈ گبن کے اس قول کی واقعات سے تصدیق نہیں ہوتی کہ دُنیا میں انسانوں کے ایسے بہت سے کلام موجود ہیں کہ اُن کی مثل فصاحت وبلاغت میں آج تک دوسرا کلام نہیں ہوا باایں ہمہ وہ من اللہ تسلیم نہیں ہوتے۔ اسی سلسلہ میں ہم مسٹر گبن سے یہ سوال کرنے کا بھی حق رکھتے ہیں کہ کیا ہومر اور ڈیماستھنز کے

زمانے کے یونانیوں نے اپنی زبان کو اس قدر ترقی دی تھی اور اس میں ایسا کمال بہم پہونچایا تھا جیسا کہ حضرت محمد صلعم کے زمانہ میں اہل عرب نے اپنی زبان کو ترقی دی تھی اور اس میں کمال بہم پہونچایا تھا۔ اور کیا ہومر اور ڈیماستھنیز نے اپنے کسی ایسے دعوے کے اثبات کے لیے جیسا کہ صاحب قرآن صلعم کا دعوے رسالت اور نبوت کا تھا اپنی ایلیڈ یا فلپکس کو دلیل گردانا تھا کیونکہ معجزہ کے لیے تحدّی یعنی معارضہ کا طلب ہونا شرط ہی۔ اور کیا ان دونوں نے اپنی قوم کو مخاطب کر کے کبھی علانیہ یہ کہا تھا کہ اگر تمام جن و انس متفق ہو جائیں تو بھی کوئی ایسی کتاب نہ لا سکینگے جیسی کہ ایلیڈ یا فلپکس۔ اور کیا اُن کا کوئی نامی گرامی فرید و حید شاعر ایلیڈ یا فلپکس کی چند سطریں پڑھ کر بے اختیار بول اُٹھا تھا کہ سوائے اس شخص کے جس پر وحی نازل ہوتی ہو کوئی بشر ایسا کلام نہیں کر سکتا اور پھر کسی طرح کے اجبار و اکراہ یا ترغیب و تحریص کے بغیر اپنا دیرینہ اور آبائی عقیدہ چھوڑ کر ہومر یا ڈیماستھنیز کے قول پر ایمان لے آیا تھا اور کیا اسی زمانہ کے فصحا اور بلغا ایلیڈ اور فلپکس کے معارضہ اور مقابلہ سے عاجز آکر اپنے خداؤں کو بچانے کے لیے تیغ و شمشیر کے ساتھ مجادلہ و مقاتلہ پر مجبور ہوئے تھے۔ اگر ان میں اس قسم کی کوئی تاثیر نہیں ہی اور ایلیڈ صرف ایک فصیح نظم ہی اور فلپکس چند بلیغ اسپیچیں اور تقریریں ہیں تو گبن صاحب کا

یہ بے دلیل قول کہ اگر قرآن کی تحریر استعداد انسانی سے بڑھ کر ہے تو ہومر کی ایلیڈ اور ڈیماستھنز کی فلپکس برتر عقل کی طرف منسوب کرنی چاہیئے" قرآن مجید کے اس دعوے کو رد نہیں کرسکتا کہ وہ اپنی فصاحت و بلاغت اور تاثیر کے اعتبار سے یکتا اور بے مثل ہے۔ لہٰذا کلام الٰہی ہے۔

کسی کلام کی فصاحت و بلاغت کی جانچ کے لیئے کوئی کسوٹی بھی تو ہونی چاہیئے۔ اور یہ کسوٹی اُس کلام کی تاثیر ہے اپنی فصاحت و بلاغت کی تاثیر کے لحاظ سے الیڈ اور فلپکس اور دُنیا کی کوئی کتاب قرآن مجید کی پُرتاثیر اور ہنگامہ خیز فصاحت و بلاغت کی بے مثالی اور بے نظیری کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ اسی وجہ سے قرآن مجید کا بے مثل اور بے مانند ہونا اُس کے من اللہ ہونے کی دلیل گردانی جاتی ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ بفرض محال کسی بشر کا کوئی ایسا فصیح و بلیغ کلام حقیقت میں موجود بھی ہو جس کی مثل دُنیا میں کوئی دوسرا کلام موجود نہیں تو اُس کے کمال اور قرآن مجید کے اعجاز میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس کلام بشری کی خصوصیت تو صرف اتنی ہی ہے کہ کسی ہمعصر مصنف نے اُس قسم کی تصنیف کی کوشش ہی نہیں کی۔ نہ اُس قسم کی کوشش کرنے کی ضرورت ہی پیش آئی۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اُس بشری کلام کے بے مثل ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ کیونکہ صاحب کلام کے کسی معاصر یا

ہم قوم نے اُس کو بے مثل اور بے مانند تسلیم نہیں کیا۔
نیز یہ بات بھی پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ جن شعرا یا مصنفین کا کلام فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے بے مثل سمجھا جانے کے قابل ہی ان کا کمال محض ایک خاص صنف کلام سے مخصوص ہوتا ہی۔ کلام کے دیگر اصناف میں وہی شاعر اور مصنف بالکل پھیکے اور بے نمک ثابت ہوتے ہیں۔ کوئی رزم کا مرد میدان ہی۔ کوئی بزم کا۔ کوئی غزل سرائی میں معاصرین پر فوق لے گیا۔ کسی کی مثنوی مشہور رہی۔ کسی نے قصیدہ گوئی میں نام پایا کوئی ظرافت نگاری میں مشہور رہا۔ کسی نے مدح سرائی میں اُستادی کا درجہ حاصل کیا۔ کسی نے ہجو نویسی میں فردوسی دیوان حافظ تصنیف نہیں کر سکتے تھے اور حافظ شیرازی انوری و خاقانی جیسے قصائد لکھنے سے معذور تھے۔ عمر خیام سے اگر کوئی مرثیہ لکھوانے کی فرمایش کرتا تو غالبًا وہ ایک شعر بھی نہ لکھ سکتے۔ سعدی کوئی شاہنامہ یا سکندر نامہ نہ لکھ سکے نہ لکھ سکتے تھے یہی حال تمام نامور شعرا اور مصنفین کا ہی ایسے ناقص کمال کو کلام الٰہی کے ہمہ گیر اعجاز کے مقابلہ میں پیش کرنا سورج کے سامنے چراغ دکھلانا کا مصداق ہی قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت کسی خاص دائرہ میں محدود نہیں ہی اور پھر جو گوناگوں اور ہمہ گیر مباحث قرآن مجید کا موضوع ہیں اُن غیر معمولی اور بلند پایہ مباحث پر بلحاظ فصاحت و بلاغت کسی

بشر کے کلام کے بے مثل ہونے کا تو آج تک کسی نے بھی مطالبہ نہیں کیا مثلاً توحید اور خدا پرستی۔ فنا اور بقا موت و حیات۔ جسم و روح۔ دنیا و آخرت حشر و نشر۔ ثواب و عذاب۔ سعادت و شقاوت۔ طہارت و نجاست۔ عبادت و ذکر الٰہی حوادث و انقلابات۔ رضا و تسلیم۔ صبر و شکر۔ بیع و شرا خیر و شر۔ مساوات و اخوت۔ اصول تمدّن۔ اصول سیاست و جہانبانی وغیرہ۔

قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت کی یہی ہمہ گیری اور ساتھ ہی مضامین کی ندرت اور بلند پروازی ہی تو تھی جس نے عرب کے بڑے بڑے فصحا و بلغا کے چھکے چھڑا دیئے۔ اور اُن سب نے اس کے سامنے گھٹنے ٹکا دیئے اور اپنے سکوت سے عملاً اپنے عجز کا اعتراف کیا۔

بشری کلام کے برخلاف قرآن مجید نے (۱) اوّل تو یہ دعویٰ کیا کہ میں بے مثل ہوں (۲) ساری دنیا کو چیلنج دیا کہ اگر تم مجھے کلام الٰہی نہیں سمجھتے تو میری جیسی ایک سطر ہی بنا لاؤ (۳) قرآن مجید نے جس قوم کو چیلنج دیا وہ فصاحت و بلاغت میں اپنے لاثانی ہونے کی مدعی تھی۔ (۴) وہ فصحا اور بلغا جو اس چیلنج کے مخاطب تھے اُن میں سے بڑے بڑے نامور زبان آوروں نے اعتراف کر کیا کہ قرآن مجید کی فصاحت بلاغت اور تاثیر کلام بشری سے بالاتر ہے اور صرف اس کلام کی تاثیر سے متاثر

ہو کر انھوں نے اسلام قبول کر لیا (۵) قرآن مجید کے مخاطب صاحب قرآن کے حد درجہ مخالف اور دشمن تھے مگر باوجود متواتر چیلنج اور ہر طرح کی کوشش کے وہ اس مقابلہ میں عاجز ثابت ہوئے۔ چونکہ ہومر کی ایلیڈ یا کسی دوسرے بشری کلام کے لاثانی ہونے کی تائید میں ایسے وجوہ پیش نہیں کیے جا سکتے لہذا قرآن مجید کا بے مثل اور بے مانند ہونا اس کا مخصوص اعجاز ہے۔ اور اس کے من اللہ ہونے کی دلیل ہے۔

بعض متشککین کا خیال ہے کہ جن لوگوں کی زبان عربی نہیں ہے وہ اس کی فصاحت و بلاغت سے ناآشنا ہیں لہذا قرآن کی فصاحت و بلاغت ان پر حجت نہیں ہو سکتی۔ یہ اعتراض ہمارے دعوے کا متناقض نہیں ہے۔ کیونکہ اس زمانہ میں اور کوئی قوم فصاحت و بلاغت کی مدعی نہ تھی جس قوم کو دعویٰ تھا اسی زبان میں قرآن نازل ہوا۔ اور ان ہی کو چیلنج دیا گیا۔ اور جب وہ قوم عاجز ہو گئی تو دوسری قوموں کو بھی اس کے بے مثل فصاحت و بلاغت تسلیم کرنی پڑے گی۔ مثلاً پنجہ کشی اور کشتی پہلوانی کے دو فن ہندوستان سے مخصوص ہیں۔ ممالک یورپ اور امریکا میں ان کا رواج نہیں۔ فرض کرو گاماں پہلوان کشتی کے فن میں اپنے بے نظیر ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور اخبارات کے ذریعہ سے دنیا کے تمام پہلوانوں کو چیلنج دیتا ہے کہ اگر کسی کو حوصلہ ہو تو میرے ساتھ کشتی لڑے۔ ظاہر ہے کہ اس چیلنج کے مخاطب

ہندوستان کے پہلوان ہوں گے کیونکہ دوسرے ممالک میں زور آزمائی کے اس طریقہ کا رواج ہی نہیں ہے۔ اگر ہندوستان کا کوئی پہلوان گاماں کے مقابلہ پر نہ آیا تو ظاہر ہے کہ مغربی ممالک میں بھی گاماں پہلوان کا کشتی کے فن میں بے نظیر ہونا تسلیم کیا جائے گا۔ مغربی ممالک میں فن کشتی کا رواج نہ ہونے کی وجہ سے وہاں کے پہلوانوں کا گاماں کے چیلنج کا مخاطب نہ ہوسکنا گاماں کے کمال میں حارج نہیں ہوسکتا۔

جن علما کا یہ خیال ہے کہ قرآن شریف کا بے مثل ہونا صرف اُس کی ہدایت کے لحاظ سے ہے تو اس پر بھی ایک حد تک یہ اعتراض وارد ہوسکتا ہے کہ عرب جیسی جاہل وحشی غیر مہذب اور ناتربیت یافتہ قوم کا قرآن مجید کے حکیمانہ اور پُر از دقایق و معارف مضامین کے مقابلہ میں اُس کے ایک سورۃ کے مانند کلام نہ لاسکنا کوئی ایسی بڑی یا اہم بات نہ تھی جو اس کلام معجز کے لئے باعثِ فخر و مباہات ہوتی۔

مگر جس طرح بعض متکلمین کے نزدیک فصاحت و بلاغت کا چیلنج صرف عرب سے ہی مخصوص سمجھا جاتا ہے اسی طرح یہ اعتراض بھی صرف اہل عرب ہی کے متعلق ہوسکتا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ بہ لحاظ ہدایت چونکہ قرآن مجید کی مخاطب ساری دنیا ہے لہذا یہ آخری اعتراض چنداں اہم نہیں ہے۔ صرف بطور الزامی جواب کے اس کا ذکر ہوا ہے۔

تیسرا باب

قرآن مجید کی بے مثل تاثیر

قرآن مجید کے دلکش اسلوب بیان اور اس کی دل پر اثر کرنے والی اور چھانے والی بے مثل فصاحت و بلاغت کے دو زبردست ثبوت ہیں ایک تو جیسا کہ دوسرے باب میں مذکور ہوا تمام فصحائے عرب کا اس کے مقابلہ سے عاجز رہنا اور دوسرے صرف اس کلام سے متاثر ہو کر ایسے ایسے ذی اثر شدید مخالفین کا اسلام قبول کرنا جو رسولؐ خدا کے جان کے لاگو تھے اور ان کو قتل کرنے پر تلے ہوئے تھے۔

جس وقت قرآن مجید نے اپنی بے نظیر فصاحت و بلاغت کا دعوی کر کے اپنے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کی مانند کفار سے بشری کلام کا مطالبہ کیا ہو اس وقت حسان ابن ثابت لبید بن ربیعہ عامری۔ عامر بن اکوع۔ طفیل بن عمرو۔ زید الخلیل۔ زبرقان۔ شماس۔ اسود بن سریع۔ کعب بن زہیر۔ عبداللہ بن رواحہ وغیرہ جیسے عرب کے شہرۂ آفاق اور آتش بیان شاعر اور فصحا موجود تھے مگر قرآن مجید کے سامنے ان سب نے سر نیاز خم کر دیا۔ حضرت عمرؓ بن خطاب کے قبول اسلام کا واقعہ زبان زد خاص و عام ہے۔ حضرت عمرؓ اسلام لانے سے

پیشتر نہایت تیز و تند مزاج تھے اور نہایت بہادر اور دلیر تھے اور مکہ میں
بہت عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ رسولؐ خدا کے سخت دشمن تھے۔ ایک روز
تلوار باندھ کر اس قصد سے گھر سے نکلے کہ جا کر آنحضرتؐ کو شہید کر ڈالیں مگر رستہ
میں نعیم بن عبداللہ ملے اور ان کا ارادہ معلوم کرکے کہا کہ محمدؐ کو قتل کرنے
کیا جا رہے ہو پہلے اپنے گھر کی تو خبر لو۔ تمہاری بہن فاطمہ اور بہنوئی سعید
دونوں محمدؐ پر ایمان لا کر مسلمان ہو چکے ہیں۔ یہ سن کر ان کو سخت طیش آیا
اور سیدھے بہن کے گھر پہونچے اتفاقاً وہ اور ان کا شوہر اور اصحاب رسولؐ
میں سے ایک شخص جو ان کو قرآن پڑھایا کرتا تھا اوراق ہاتھ میں لیے ہوئے
سورہ طٰہٰ پڑھ رہے تھے کہ یکایک یہ آن پہونچے اور وہ ان کی آہٹ پاکر
چپ ہو گئے اور ورق کو چھپا لیا۔ جب ان کے پوچھنے پر انھوں نے کہا کہ
ہم تو کچھ نہیں پڑھتے تھے تو طیش میں آکر بہنوئی پر جھپٹے۔ اور ان کی خوب خبر
لی۔ جب اس کی بیوی اس کے بچانے کے لیے اٹھی تو اس کو لہو لہان کر دیا مگر
آخر وہ بھی ان ہی کی بہن تھی۔ اسلام کا نشہ ایسا نہ تھا جو چڑھ کر اتر جائے۔
کہنے لگیں عمر تمہارے جو جی میں آئے کرو۔ ہم اسلام چھوڑنے سے رہے بہن
کا یہ استقلال دیکھ کر انھیں حیرت ہوئی۔ پھر بہن کو لہو لہان دیکھ کر دل نرمایا
اور نرم آواز سے پوچھنے لگے کہ اچھا بتلاؤ تم کیا پڑھ رہے تھے مجھے بھی سناؤ
بیچاری ڈرتے ڈرتے وہ ورق اٹھا لائیں۔ اور بہت کچھ عہد و قرار ہو کر ورق

اُن کے ہاتھ میں دیا گیا۔ حضرت عمر نے پڑھنا شروع کیا جب پڑھتے پڑھتے وہ اس آیت پر پہونچے اِنَّنِیْ اَنَا اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ ۝ (یعنی ہم ہی اللہ ہیں۔ ہمارے سوا کوئی معبود نہیں تو ہماری ہی عبادت کیا کرو اور ہماری ہی یاد کے لیے نماز پڑھا کرو) تو اُن کے قلب پر ایسا اثر ہوا کہ سیدھے آنحضرت صلعم کی خدمت میں میں پہونچے۔ اور آئے تھے آنحضرت صلعم کو قتل کرنے کی نیت سے مگر جاتے ہی نہایت عاجزی سے عرض کیا کہ مجھے بھی دولت اسلام سے مالا مال کیجیے اور پھر حرم کعبہ میں پہونچکر علانیہ کہدیا کہ میں تو محمدؐ اور اُن کے خدا پر ایمان لے آیا اور تمام دن مشرکوں کے ساتھ لڑائی اور مار پیٹ میں گزرا۔ (تاریخ ابن اثیر جلد دوم صفحہ ۳۳-۳۴ و تاریخ ابو الفدا جلد دوم صفحہ ۱۱۹ ۱۲۰ و تاریخ ابن ہشام صفحہ ۲۲۶-۲۲۷)

حضرت عمرؓ کا ایمان لانا سب کو تسلیم ہے۔ جس وقت آپ ایمان لائے کل مسلمانوں کی تعداد ۳۸ تھی اور یہ سب مسلمان اس قدر مغلوب اور مقہور تھے کہ گھر کے اندر چھپ کر نمازیں پڑھا کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے سب سے پہلے اصرار کیا کہ کعبہ میں چل کر کھلے بندوں نماز پڑھی جائے اب سوال یہ ہے کہ اگر قرآن مجید کی تاثیر نے آپ کی کایا پلٹ نہیں کی تو آخر وہ اور کیا اسباب تھے جو آپ کے ایمان لانے کے محرک ہوئے۔ جو واقعہ

اوپر بیان ہوا یہ سب تاریخی واقعہ ہے جس کی آج تک کسی نے تکذیب نہیں کی
مکہ معظمہ کے پاس بمقام "عکاظ" برسویں دن ایک میلا لگتا تھا اور تمام عرب
کے لوگ اور نامور فصحا اور بلغا وہاں جمع ہوتے تھے اس میلہ میں بڑے
بڑے نامور شعرا اپنے قصیدے اور اشعار پڑھ کر سناتے تھے۔ اور جو
قصیدہ پسند ہوتا تھا تمام میلہ میں اس کی دھوم پڑ جاتی تھی اور ہرن
بکری یا اونٹ کی جھلی یا ریشمی کپڑے پر سنہرے حرفوں میں نقش و نگار سے
مزین کر کے کعبہ کی دیوار پر اس کو آویزاں کیا جاتا تھا اور معلقہ کہلاتا تھا
چنانچہ سبعہ معلقہ جو عربی کے نہایت مشہور و معروف سات قصیدے
ہیں انھیں میں سے ہیں۔ کعبہ کی دیوار پر قصیدہ کا آویزاں ہونا بڑا ہی
موجب فخر سمجھا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ مصنف کے پاس قبیلوں سے
مبارکباد کے پیام آتے تھے۔ الغرض ان کا سرمایۂ نازلے دیکر ایک یہی
زبان تھی۔ جس پر وہ نہایت اتراتے تھے اور اپنے مقابلہ میں تمام
دنیا کو گونگا اور بے زبان (عجم) بتلاتے تھے۔ جب خدا نے اپنے فضل و کرم
سے ان لوگوں کی ذلیل اور زبوں حالت پر رحم کھا کر خود ان ہی میں سے
ایک شخص کو (دل وجانم فدائے نامش باد) ان کی تعلیم وہدایت کے
لیے کھڑا کیا۔ اور ان پر اپنا کلام نازل فرمایا۔ تو اقتضائے وقت سے ضرور
تھا کہ وہ کلام جو نہ صرف قوم عرب بلکہ تمام اقوام عالم کی ہدایت و تعلیم

کے لیے نازل ہوا تھا اپنی معنوی خوبیوں اور روحانی برکتوں کے علاوہ لفظی لطافتوں اور ظاہری کمالوں سے بھی ایسا مملو اور معمور ہو کہ اس کی مثل دوسرا کلام پیش کرنا ناممکن ہو تاکہ وہ قوم جاہل جو ثبوت و دقائق علم مبدا و معاد سے بالکل ناواقف اور بے خبر صرف کلام کی ظاہری خوبی یعنی فصاحت و بلاغت ہی کو ایک بڑی چیز سمجھے ہوئے تھی اس کے معارضہ سے عاجز ہو کر اس کو کلام الہٰی جانتے اور اس پر ایمان لاتے چنانچہ یہی سبب تھا کہ جب کافروں نے اس کلام پاک کے من اللہ ہونے میں شک کیا اور کبھی جادو اور کبھی شعر اور کبھی کاہنوں کا کلام بتلایا تو خدا نے بطور حجت اور دلیل صداقت اپنے رسول کے اسی چیز میں ان سے معارضہ چاہا جس کا ان کو بڑا گھمنڈ تھا اور نہ صرف ایک بار بلکہ کئی بار۔

عرب کا سب سے بڑا نامی گرامی شاعر جو دنیا میں اپنی بے نظیر اور بے عدیل ہونے کا مدعی تھا اور جس کا نام لبید تھا۔ سورہ بقرہ کی چند آیتیں پڑھ کر بے اختیار چلا اٹھا کہ خدا اور اس شخص کے سوا جس پر وحی نازل ہوتی ہے کوئی انسان ایسا کلام نہیں کرسکتا۔ اور فوراً شرک و بت پرستی چھوڑ کر خدا پرست مسلمان بن گیا۔

جارج سیل" انگلستان کا ایک مشہور مستشرق ہو (سنہ ۱۶۹۰ تا ۱۷۳۶ء) جس نے

قرآن مجید کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہی۔ اُس نے اپنے ترجمہ قرآن مجید کے دیباچہ میں لبید کے ایمان لانے کے واقعہ کی تصدیق کی ہی۔ وہ لکھتا ہی

"یہ بات بالعموم مسلم ہی کہ قرآن قریش کی بولی میں جو جملہ اقوام عرب میں شریف ترین اور مہذب ترین قوم ہی۔ انتہائی لطیف اور پاکیزہ زبان میں لکھا گیا ہی۔ وہ بے شک عربی زبان کا نمونہ ہی اور زیادہ پکے عقیدے کے لوگوں کا یہ قول ہی۔ نیز اس کتاب سے بھی ظاہر ہی کہ کوئی انسان اس کے مثل نہیں لکھ سکتا۔ اور اسی واسطہ اُسے لازوال معجزہ قرار دیا ہی جو مردہ کے زندہ کر دینے سے بڑھکر ہی۔ اور تمام دُنیا کو اپنے ربانی الاصل ہونے کا ثبوت دینے کے لیئے اکیلا کافی ہی اور خود محمدؐ نے بھی اپنی رسالت کے ثبوت کے لیئے اس معجزہ کی طرف رجوع کیا تھا۔ اور بڑے بڑے فصحائے عرب کو جہاں کہ اُس زمانہ میں اس قسم کے ہزارہا آدمی موجود تھے جن کا محض یہ مشغلہ تھا کہ طرز تحریر اور عبارت آرائی کی لطافت میں سب سے زیادہ لائق و فائق ہو جائیں، علانیہ کہلا بھیجا تھا کہ اس کے مقابلہ کی ایک سورۃ ہی بنا لاؤ۔ اس بات کے اظہار کے واسطے کہ اس کتاب کی خوبی تحریر کی اُن ذی لیاقت لوگوں نے بھی فی الواقع تعریف اور توصیف کی تھی جن کا اس کام میں مبصر ہونا مسلّم ہی۔ منجملہ بے شمار مثالوں کے ایک مثال کو بیان کرتا ہوں

لبید بن ربیعہ عامری جو محمدؐ کے زمانہ میں سب سے بڑے زبان آور وں میں تھا اس کا ایک قصیدہ خانہ کعبہ کے دروازہ پر چسپاں تھا یہ رتبہ صرف نہایت اعلیٰ درجہ کی تصنیف کے لیے مرعی تھا۔ (نوٹ مشہور و معروف قصائد "سبعہ معلقہ" میں سے چوتھا قصیدہ وہی ہے جس کا ذکر مسٹر سیل نے اپنے اس بیان میں کیا ہے مولف) اور کسی شاعر کو اس کے مقابل میں کسی اپنی تصنیف کے پیش کرنے کی جرات نہ ہوتی تھی لیکن جبکہ کچھ عرصہ کے بعد قرآن کی دوسری سورۃ (بقر) کی آیتیں اس کے مقابلہ میں لگائی گئیں تو خود لبید جو اس زمانہ میں مشرکین میں سے تھا شروع ہی کی آیت پڑھ کر بحر تحیر میں غوطہ زن ہوا۔ اور فی الفور اسلام قبول کر لیا اور بیان کیا کہ ایسے الفاظ صرف نبی ہی کی زبان سے صادر ہو سکتے ہیں"

اس کے بعد آگے چل کر مسٹر سیل لکھتے ہیں کہ

"قرآن کا طرز تحریر عموماً خوش آئند اور رواں ہے۔ بالخصوص اس جگہ جہاں وہ پیغمبرانہ شعار اور توریتی جملوں کو نقل کرتا ہے۔ وہ مختصر اور بعض مقامات میں مبہم ہے۔ اور مشرقی ڈھنگ کے مطابق پُر جبرت صنعتوں سے مرصع اور روشن اور پُر معنی جملوں سے مزین ہے۔ اور اکثر مقامات میں خصوصاً جہاں اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اوصاف کا بیان آتا ہے نہایت عالی مرتبہ

اور رفیع الشان ہے"

کیا اُن ہزارہا فصحا اور بلغا میں جن کا بقول مسٹر سیل صرف یہ مشغلہ تھا کہ طرز تحریر اور عبارت آرائی کی لطافت میں لایق اور فایق ہو جائیں۔ کوئی بھی ایسا نہ تھا جو ایک ایسے شخص کا کہ جو نہ کسی مکتب میں بیٹھا نہ کسی استاد سے پڑھا اور نہ کسی شاعر سے شعر کہنا سیکھا مقابلہ کرتا اور قرآن کے طرز کے چند چھوٹے چھوٹے فقرے لکھ کر اُس کے دعوے کو رد کر دیتا۔ اور اس طرح اپنی قوم اور اپنے خداؤں کو اُس ذلت و رسوائی سے بچا لیتا جن کی پیغمبر عرب سے اُن کو شکایت تھی کہ وہ کرتے ہیں۔ اور باوجود اس بار بار چیلنج کے کوئی فصیح و بلیغ شخص اُس کی نبرد یا نہ کر سکا۔ اور وہ لوگ لفظی مقابلہ سے عاجز آکر تیر و شمشیر کے ساتھ مقاتلہ پر مجبور ہوئے تو صاف ثابت ہے کہ یہ ایک ربانی کرشمہ تھا جس نے تمام فصحائے و بلغائے عرب کو قرآن مجید کے مقابلہ میں لاچار اور عاجز کر دیا۔

اپنی تفسیر فتح المنان موسوم بہ تفسیر حقانی کی جلد ہشتم کے صفحہ ۳۶۱ میں جارج سیل کی طرح علامہ ابو محمد عبدالحق صاحب حقانی دہلوی نے سورہ کوثر کی نسبت بھی بیان کیا ہے کہ جب سورہ اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ کو تین مصرعوں کی شکل میں لکھ کر خانہ کعبہ پر اس غرض سے آویزاں کیا گیا کہ چوتھے مصرعہ کی جو جگہ خالی ہے وہ کوئی نامور شاعر پُر کر دے۔ تو ایک شاعر نے یہ چوتھا مصرعہ اضافہ کیا ھٰذَا لَیْسَ مِنْ قَوْلِ الْبَشَرِ (یعنی یہ بشر کا کلام ہی نہیں)

آنحضرتؐ کی نبوت کو چار سال گزر چکے تھے مکہ کافروں کا ظلم برابر بڑھتا چلا جاتا تھا مسلمانوں کو سخت سخت ایذائیں پہونچاتے تھے جب پانی سر سے گزر گیا تو آنحضرتؐ نے اپنے ستم رسیدہ اصحاب کو ملک حبش کی طرف ہجرت کرجانے کی ہدایت فرمائی۔ چنانچہ سب سے پہلے پندرہ شخص اپنے پیارے وطن اور خانماں سے دست بردار ہوکر وہاں چلے گئے۔ اس گروہ میں پیغمبر صاحب کی صاحبزادی رقیہؓ اور اُن کے شوہر حضرت عثمانؓ بن عفان اور آنحضرتؐ کے پھوپی زاد بھائی زبیر بن عوام بھی تھے۔ ان کے بعد اور بہت سے مرد اور عورتیں جنھوں نے راہ خدا میں بڑی بڑی سختیاں جھیلیں اور جن کی تعداد قریب ایک سو کے تھی حبش پہونچکر ان کے شریک ہوگئے اس جماعت میں آنحضرتؐ کے چچا زاد بھائی حضرت جعفر طیار بن ابی طالب شریک تھے۔ دشمنوں نے وہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا اور بہت سے تحائف لیکر نجاشی بادشاہ حبش کے پاس گئے جو ایک نیک دل عیسائی تھا۔ اور کہا کہ ہمارے چند بے سمجھ آدمیوں نے ایک نیا دین ایجاد کیا ہے اور اپنے آبائی دین سے پھر گئے ہیں اور بھاگ کر آپکے ملک میں پناہ لی ہے انھیں آپ ہمارے سپرد کردیجئے۔ اور بادشاہ کو مشتعل کرنے کی غرض سے یہ بھی کہا کہ یہ لوگ ہمارے ہی مذہب کو برا نہیں کہتے بلکہ آپ کے عیسائی مذہب کو بھی برا کہتے ہیں یہ حالات سن کر نجاشی نے مسلمانوں کو دربار میں بلایا

اور پوچھا وہ نیا دین کیا ہے جس کی خاطر تم نے اپنے آبائی دین کو چھوڑ دیا اور ہمارا دین اختیار کیا نہ کسی اور قوم کا۔ اُس وقت حضرت جعفرؓ نے جو جناب علی مرتضیٰؓ کے حقیقی بھائی تھے مسلمانوں کا نمائندہ بن کر نجاشی کے سامنے اپنے مذہب کی خوبیاں بیان کیں اور بتلایا کہ ہم کس طرح گمراہی میں مبتلا تھے اور گناہوں سے آلودہ تھے پیغمبرؐ نے ہمیں ضلالت سے نکال کر کس طرح اعلیٰ مقام پر پہونچا دیا۔ تب اس نے پوچھا کہ تم لوگ حضرت عیسےٰؑ کے بارہ میں کیا کہتے ہو۔ اس پر اُنھوں نے سورہ مریم کی وہ آیات جن میں حضرت عیسےٰؑ کی پیدائش کا ذکر ہے ایسے لب و لہجہ اور موثر انداز سے پڑھ کر سنائیں کہ بقول مستند مورخین کے نجاشی پر ایسا اثر ہوا کہ وہ رو پڑا اور اُس نے اقرار کیا کہ قرآن مجید نے حضرت عیسےٰؑ کے بارہ میں جو کچھ بیان کیا ہے اس سے وہ ایک تنکے کے برابر بھی زیادہ نہ تھے"۔ اس کے بعد نجاشی نے قریش کے سرداروں کو جواب دیا کہ میں ان مظلوموں کو تمھارے حوالے نہیں کرسکتا۔ اور مسلمانوں سے کہا کہ تم بلاخوف و خطر یہاں رہو۔ میری عملداری میں تم کو کوئی شخص اذیت نہیں پہونچا سکتا۔ اس واقعہ کا قرآن شریف میں بھی ذکر ہے۔ چنانچہ سورہ مائدہ کے گیارھویں رکوع میں ارشاد ہوتا ہے

وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝

وَاِذَا سَمِعُوْا مَا اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰۤى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ (ترجمہ۔ اور مسلمانوں کے ساتھ دوستی کے اعتبار سے سب لوگوں میں اُن کو قریب تر پاؤ گے جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں مسلمانوں کی طرف نصاریٰ کا یہ میلان اس سبب سے ہے کہ ان میں علماء اور مشائخ ہیں۔ اور نیز یہ لوگ تکبر نہیں کرتے۔ اور جب قرآن کو سُنتے ہیں اس رسول (محمدؐ) پر نازل ہوا ہے تو اے مخاطب تو ان کی آنکھوں کو دیکھتا ہے کہ ان سے آنسو جاری ہیں اس لئے کہ انھوں نے حق بات کو پہچان لیا ہے۔)

مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہ آیتیں نجاشی بادشاہ حبش اور اُس کے درباریوں کے حق میں نازل ہوئیں جو نصاریٰ تھے۔

ریورنڈ مسٹر باسورتھ اسمتھ ایم۔ اے۔ انگلستان کے ایک مشہور و معروف منصف مزاج محقق ہیں جنھوں نے ازراہ انصاف پسندی باوجود عیسائی مذہب رکھنے اور پادری ہونے کے رسول خدا صلعم اور اسلام کی تائید میں ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام "محمدؐ اور محمد ازم" ہے۔ یہ کتاب ۱۸۸۹ء میں بمقام لندن شایع ہوئی تھی۔ انھوں نے بھی اپنی اس کتاب میں مذکورہ بالا واقعہ کا ذکر کیا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں

کہ دس برس اور گزر گئے اور محمدؐ کے اصول مذہب باوجودیکہ چاروں

طرف سے نہایت سخت اندیشوں اور مزاحمتوں کی بوچھار تھی صرف
اپنے اخلاقی ذریعوں اور اپنی ذاتی قوت سے اپنا راستہ صاف
کرتے جاتے تھے مگر جس قدر کہ اُن کے پیرووں کی تعداد بڑھتی گئی
اُسی قدر مخالفین کا تشدد اور ایذا رسانی بھی جو اُس کے معتقدین
کو برداشت کرنا پڑتی تھی زیادہ ہوتی گئی۔ اور آخر کار محمدؐ نے یہ
پسند نہ کرکے کہ اُس کے پیرو اپنے نئے مذہب میں داخل ہوتے
ہی ایسے پُرملال امتحان میں مبتلا ہو جائیں اُنھیں یہ صلاح
دی کہ ملک حبش میں جاکر پناہ گزیں ہوں۔ چنانچہ بیز رہ آدمیوں
نے اُس کی صلاح مانی۔ اور محمدؐ بدستور وہیں رہے۔ ان لوگوں
کا محمدؐ کی صلاح مان لینا کچھ افسوس کی بات نہیں ہے۔ کیونکہ
اوّل تو اگر کسی ثبوت کی ضرورت ہو تو یہ ایک یقینی ثبوت اس
امر کا ہے کہ اس تمام زمانہ میں محمدؐ کی اصل قوت اُس شے میں تھی جس کو
دُنیا اُس کی کمزوری کہے گی (یعنی آپ کا بے یار و مددگار رہونا)
دوم یہ کہ اس واقعہ کے سبب سے جو ہجرت کہلاتا ہے اس میں
نبیؐ عربی کی ابتدائی تعلیم کا ایک اعلیٰ درجہ کا خلاصہ ہاتھ آگیا ہے
جو اب تک ہمارے پاس موجود ہے (نوٹ۔ یہ خلاصہ تعلیم و ہدایت
قرآنی کے ذیل میں نقل کیا جائے گا۔ مؤلف) قوم قریش نے نجاشی

بادشاہ حبش کے پاس یہ پیغام بھیجا کہ ان فراریوں کو ہمارے حوالے کر دو تاکہ ہم انھیں قتل کر ڈالیں لیکن اس گروہ میں سے جعفر نامی ایک شخص نے آگے بڑھ کر بادشاہ اور اُن پادریوں کے سامنے جو اس غرض سے بُلائے گئے تھے اور انجیلیں ساتھ لیکر آئے تھے اپنے تبدیل مذہب کے وجوہ بتلائے، (نوٹ. مسٹر باسورتھ اسمتھ صاحب نے اپنی کتاب میں حضرت جعفر کی تقریر کا ترجمہ لکھا ہے۔ اور تاریخ ابن ہشام میں حضرت جعفرؓ کے خطبہ کے اصل الفاظ نقل کیے گئے ہیں جن کا ترجمہ تعلیم و ہدایت قرآنی کے سلسلہ میں آئندہ درج ہوگا۔ مولف) تبدیل مذہب کے وجوہ بیان کرنے کے بعد حضرت جعفرؓ نے فرمایا کہ "جب مشرکین نے ہم کو نہایت عاجز کر دیا اور طرح طرح کے ظلم کیے اور نہایت دق اور تنگ کیا اور ہمارے دین میں مزاحم ہوئے تو ہم اپنا وطن چھوڑ کر اور تجھ کو اور بادشاہوں کی نسبت بہتر سمجھ کر تیرے ملک میں چلے آئے۔ اور یہ اُمید کر کے کہ تیرے ہوتے ہوئے کوئی شخص ہم پر ظلم نہ کر سکے گا تیری پناہ اختیار کی "۔ اس تقریر کے بعد کا واقعہ اوپر مذکور ہو چکا ہے۔)

انہیں قبیلہ غفار کے شاعر تھے اُنھوں نے جب آنحضرت صلعم کا چرچا سُنا تو

چھپ کر مکہ آئے اور آں حضرتؐ کی زبان مبارک سے کلام مجید کی کچھ آیتیں سُن کر واپس چلے گئے اُن کے بھائی نے پوچھا کہ تم نے محمدؐ کو کیسا پایا انھوں نے جواب دیا کہ قریش کہتے تھے کہ وہ شاعر ہیں ساحر ہیں۔ کاہن ہیں۔ ہم نے کاہنوں کا کلام سُنا ہے۔ یہ اُن کی بولی نہیں۔ ہم نے شعر کے ہر ایک وزن کو جانچا ہے۔ وہ شعر بھی نہیں۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ محمدؐ سچے اور قریش جھوٹے ہیں۔ (صحیح مسلم)

ولید بن مغیرہ قریش میں بڑا دولتمند اور صاحب اثر شخص تھا۔ وہ ایک دفعہ آپ کی خدمت میں آیا اور فرمائش کی کہ کچھ پڑھ کر سُنایئے۔ آپؐ نے چند آیتیں پڑھیں اس نے مکرر پڑھوا کر سُنیں۔ آخر بے خود ہو کر بولا قسم ہے کہ اس میں کچھ اور ہی شیرینی اور تازگی ہے۔ یہ کسی انسان کا کلام نہیں

حضرت عثمانؓ بن مظعون نے کلام مجید کی چند آیتیں سُن لیں اور فوراً علقۂ بگوش اسلام ہو گئے۔ حضرت طفیل بن عمرو کے کانوں میں اتفاقیہ قرآن مجید کی چند آیتیں پہونچیں اور وہ مسلمان ہو گئے۔ یہ سب تاریخی واقعات ہیں۔ اور صحیح احادیث کی کتابوں میں منقول ہیں۔ کلام کی یہ شیرینی یہ نمکینی۔ یہ تاثیر اور یہ تسخیر جو دوست دشمن۔ موافق اور مخالف۔ شاہ و گدا اور عالم و جاہل سب کو یکساں فریفتہ کرتی ہیں یہ اعجاز نہیں تو اور کیا ہے؟

مسٹر ٹامس کارلائل انگلستان کے نامور عالم و فاضل اپنی کتاب لکچر ز آن ہیرو ز میں لکھتے ہیں کہ

اسلام قوم عرب کے حق میں گویا تاریکی میں روشنی کا آنا تھا عرب کا ملک پہلے پہل اس کے ذریعہ سے زندہ ہوا۔ اہل عرب گلہ بانوں کی ایک غریب قوم تھی اور جب سے دنیا بنی تھی عرب کے چٹیل میدانوں میں پھرا کرتی تھی اور کسی شخص کو ان کا کچھ خیال بھی نہ تھا۔ اس قوم میں ایک اولوالعزم پیغمبر ایسے کلام کے ساتھ جس پر وہ یقین کرتے تھے بھیجا گیا۔ اب دیکھو کہ جس چیز سے کوئی واقف ہی نہ تھا وہ تمام دنیا میں مشہور و معروف ہوئی اور چھوٹی چیز نہایت بڑی چیز بن گئی۔ اس کے بعد ایک صدی کے اندر عرب کی ایک طرف غرناطہ اور دوسری طرف دہلی ہو گئی عرب کی بہادری اور عظمت کی تجلی اور عقل کی روشنی زمانہ ہائے دراز تک دنیا کے ایک بڑے حصہ پر چمکتی رہی۔ اعتقاد ایک بڑی چیز ہے اور جان ڈالنے والا ہے۔ جس وقت کوئی قوم کسی بات پر اعتقاد لاتی ہے تو اس کے خیالات بارآور بلند اور روح کو عظمت دینے والے ہو جاتے ہیں۔ یہی عرب اور یہی محمد اور یہی ایک صدی کا زمانہ گویا ایک چنگاری ایسے ملک میں پڑی جو ایک کسمپرسی

تاریک ریگستان تھا۔ مگر دیکھو کہ اس تاریک ریگستان نے زور شور سے اڑ جانے والی بارود کی طرح نیلے آسمان تک اٹھتے ہوئے شعلوں سے دہلی سے غرناطہ تک روشن کر دیا"

جان گوئٹھے جرمنی کا نہایت مشہور شاعر اور فلسفی گزرا ہے اس کا قول ہے کہ جس قدر ہم اس کتاب (قرآن شریف) کے قریب پہنچتے ہیں یعنی اس پر زیادہ غور کرتے ہیں وہ ہم سے دور کھنچی جاتی ہے (یعنی زیادہ اعلیٰ معلوم ہوتی ہے) وہ بتدریج فریفتہ کرتی ہے۔ پھر متعجب کرتی ہے۔ اور آخرکار فرحت آمیز تحیر میں ڈالدیتی ہے"

مکہ شریف میں جب آنحضرت صلعم نے اسلام کی تبلیغ شروع کی اور بعض چیدہ افراد نے اسلام قبول کر لیا تو قریش کا غیظ و غضب حد سے تجاوز کر گیا۔ لہٰذا آنحضرتؐ کو اور اُن کے اصحاب کی مختصر تعداد کو طرح طرح کی ایذائیں اور تکلیفیں دینے لگے۔ چنانچہ جن بیکس مسلمانوں کا کوئی حامی اور مددگار نہ تھا اُن کی مشکیں باندھ کر اول خوب مارتے اور پھر ٹھیک دوپہر کی تیز و تند دھوپ میں جھلستی ہوئی زمین پر بھوکا پیاسا کبھی اوندھا کبھی سیدھا لٹادیتے اور بڑے بڑے بھاری پتھر چھاتی پر رکھدیتے جس کے بوجھ کے مارے زبان باہر نکل پڑتی۔ کسی کی آنکھ پھوڑ ڈالتے۔ کسی کو نیزے یا تلوار سے زخمی کرتے اور کہتے یا تو محمدؐ اور اُس کے خدا کو گالیاں دو اور ہمارے بتوں

کی تعریف اور اُن کے پوجنے کا اقرار کرو ورنہ اسی طرح عذاب دے دے کر تم کو مار ڈالیں گے۔ مگر یہ خدا کے سچے بندے اس شدید تکلیف اور اذیت کی مطلق پرواہ نہ کرتے اور ہر حال میں خدا کا شکر بجا لاتے۔ اور بعض ادمی عذاب اور تکلیف کی حالت میں جان سے گزر جاتے۔

ظالم ابو جہل یاسر نام ایک صحابی کو بہت تکلیف دے رہا تھا یاسر کی والدہ سُمیہ نے اُس کو بُرا بھلا کہا اُس ظالم نے طیش میں آکر سُمیہؓ کے نیزہ مارا کہ اُن کی جان نکل گئی۔ اسلام میں یہ خاتون سب سے پہلی شہید ہیں یاسر بھی اذیتوں کو برداشت نہ کر سکے اور دنیا سے چل بسے۔ یاسر کے والد عمار اُن مشکیں باندھ کر مکہ کی جلتی ہوئی پتھریلی زمین پر لٹا کر اُن کے سینہ پر بہت بھاری پتھر رکھدیا جاتا اور کبھی پانی میں غوطے دیئے جاتے مگر یہ اپنے ایمان پر ثابت رہے یہی حال خبابؓ بن ارتؓ کا تھا کہ ننگا کر کے نہایت گرم زمین پر ڈال دیا جاتا۔ اور آگ سے گرم کی ہوئی پتھر کی بڑی بڑی سلیں اُن کے سینہ پر رکھی جاتیں۔ اور سر کے بال کھینچکر گردن مروڑی جاتی مگر اُن کو ان تکلیفوں کی سر مو پرواہ نہیں ہوئی۔ جب حضرت زبیر اسلام لائے تو آپ کا چچا آپ کو بورئیے میں لپیٹ کر آگ لگا دیتا اور کہتا کہ اسلام چھوڑ دو مگر آپ فرماتے کہ ایسا ہر گز نہ ہوگا حضرت بلال نے دین کی محبت میں اپنی جان کو ہیچ سمجھا اور ہر طرح کی تکلیف برداشت کرتے رہے یہاں تک

کہ مشرکین عاجز آ گئے اور اپنے لڑکوں سے کہا کہ بلال کے گلے میں رسی باندھ کر مکہ کے ارد گرد گھسیٹتے پھر وہ بلال اس نازک حالت میں بھی "احد احد" پکارتے غرض اس قسم کے بے شمار مظالم ہوتے رہے۔ مگر کلام ربانی کی "تاثیر" نے مسلمانوں کے قلوب میں ایسا گہرا اثر کیا تھا کہ وہ اسلام کے مقابلہ میں اپنی جان کی مطلق پرواہ نہ کرتے تھے گوناگوں صعوبتوں اور اذیتوں کی برداشت اور اسلام کی محبت محض کلام الٰہی کی "تاثیر" ہی کا نتیجہ تھا ورنہ اُن کی ثابت قدمی کا اور کیا ممکن سبب ہو سکتا تھا۔

جب آنحضرتؐ ہجرت کر کے مدینہ شریف میں رونق افروز ہوئے تو آپ ہمیشہ اہل مدینہ کو کلام الٰہی کا وعظ فرمایا کرتے تھے اور طالبان حق شرک و بت پرستی چھوڑ کر نہایت رغبت اور صدق دل سے مشرف باسلام ہوتے جاتے تھے چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ میں اُس قبیلہ کے تمام لوگ جس میں آپ تشریف فرما تھے کیا مرد کیا عورت سب خدا کے دین میں داخل ہو گئے۔ اور اس معجزانہ دل ہلا دینے والے کلام کے اثر سے وہی حقانیت اور روحانیت اُن کی طبیعتوں میں بھی سرایت کر گئی جو مہاجرین کے دلوں میں سمائی ہوئی تھی۔ چنانچہ سر ولیم میور اپنی کتاب "لائف آف محمدؐ" کی جلد دوم کے صفحہ ۲۷۱ پر ارقام فرماتے ہیں کہ

"یہودیوں کی حقانی باتیں عرصہ سے اہل مدینہ کے گوش گزار

ہو چکی تھیں مگر وہ بھی اُس وقت تک خواب خرگوش سے نہ چونکے جب تک کہ روح کو کپ کپا دینے والا کلام نبی عربی کا اُنھوں نے نہیں سُنا۔ تب البتہ دفعتاً ایک نئی اور سرگرم زندگانی کا دم بھرنے لگے"

کلام مجید کی جس حیرت انگیز تاثیر کی بدولت عرب جیسی جاہل اور وحشی قوم خدا پرست بن گئی اُس کی بابت مسٹر سیل قرآن مجید کے اپنے انگریزی ترجمہ کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ

"دنیا میں اسی دین کو وہ قبولیت حاصل ہوئی جس کی کوئی مثال اور نظیر نہیں ہے۔ اور اس دین کو نہ صرف اُن قوموں نے قبول کیا جن پر مسلمانوں نے کبھی فوج کشی نہ کی تھی بلکہ اُن لوگوں نے بھی قبول کر لیا جنھوں نے اہل عرب کو اُن کی فتوحات سے محروم اور اُن کی سلطنت بلکہ اُن کے خلیفوں کا خاتمہ کر دیا اور اور جس میں کوئی بات اُس سے بڑھکر تھی جو ایک مذہب میں عموماً خیال کی جاتی۔ اور جس کی وجہ سے اُسے ایسی عجیب ترقی نصیب ہوئی"

(نوٹ۔) غالباً مسٹر سیل کا اشارہ تاتاریوں کے اسلام قبول کرنے کی طرف ہے۔ چنگیز خاں والی خراسان کے پوتے ہلاکو خاں نے ۶۵۶ھ ہجری میں خلافت عباسیہ کا خاتمہ کر دیا اور دارالخلافہ بغداد کو تباہ کر ڈالا

مگر ۱۲۶۰ ہجری میں ہلاکو خاں کے ایک بیٹے نے اسلام قبول کر کے
اپنا نام احمد خاں رکھا اور تاتاری بہ تعداد کثیر مسلمان ہو گئے۔ (مولف)

آنحضرتؐ مدینہ شریف میں بہ حیثیت فاتح یا حملہ آور کے داخل نہیں ہوئے تھے بلکہ اہل مدینہ کی دعوت پر صرف تبلیغ اسلام کی غرض سے تشریف لائے تھے۔ آپ کے پاس سوائے کلام الٰہی کے تبلیغ کا مطلق اور کوئی ذریعہ یا وسیلہ نہ تھا۔ اسی کلام پاک کی تاثیر سے لوگ مشرف بہ اسلام ہوتے تھے۔ آنحضرت صلعم جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا اُمّی محض تھے۔ لکھنا پڑھنا نہ جانتے تھے آپ صرف کلام الٰہی کو دہراتے تھے۔ جو بذریعہ وحی آپ پر نازل ہوتا تھا۔ اسی کلام ربانی کی تاثیر سے مکہ میں اسلام پھیلا اور اسی کلام الٰہی کی بدولت اہل مدینہ دولت اسلام سے مالا مال ہوئے۔

مذکورہ بالا تمام واقعات کو پیش نظر رکھ کر سوچو اور غور کرو کہ جس کلام نے اس طرح بڑے بڑے فصحا و بلغا اور شرفاء عرب کا ناطقہ بند کر کے اسلام کے نور سے ان کے قلوب کو منور کر دیا یہ قرآن مجید کی تاثیر نہ تھی تو اور کیا تھا کیا دنیا کی تاریخ حضرت عمرؓ اور لبید بن ربیعہ جیسی نامور ہستیوں کی کایا پلٹ کی نظیر پیش کر سکتی ہے؟ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۛ

چوتھا باب

آنحضرت محمد صلعم کی اُمیّت بھی قرآن مجید کا اعجاز ہی

آنحضرت صلعم کے زمانہ سے پیشتر نیز حضرت کے زمانہ میں ملک عرب میں تعلیم کا کوئی معین یا باقاعدہ طریقہ جاری نہ تھا عربی میں علم کی صرف دو شاخیں تھیں۔ یعنی قدرتی فصاحت و بلاغت اور علم الانساب۔ ان کی تحصیل کے لیے کسی مکتب یا مدرسہ میں تعلیم پانے کی ضرورت نہ تھی۔ اُن کا دارومدار صرف ربّانی تعلیم پر تھا۔ اسی وجہ سے اُس زمانہ میں بے شمار آدمی لکھنا اور پڑھنا نہیں جانتے تھے اور جو لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے اُن کی تعداد بہت کم تھی۔

ایک روایت کے مطابق آغاز اسلام کے وقت سارے حجاز میں کل سترّہ آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے دوسرا راوی لکھتا ہے کہ پورے صوبہ حجاز میں اُس وقت بمشکل چھ یا سات آدمی لکھنے پڑھنے سے واقف تھے۔ خلاصہ یہ کہ عرب میں لکھنے پڑھنے کا رواج بہت ہی کم تھا۔ جو لوگ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے وہ اُمّی کہلاتے تھے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ آنحضرت صلعم کو لکھنا پڑھنا کچھ نہیں آتا تھا۔ نہ وہ خود کچھ لکھ سکتے تھے اور نہ دوسروں کا لکھا پڑھ سکتے تھے۔ اور اسی سبب سے آنحضرتؐ کا لقب اُمّی ہو گیا تھا۔ اس بیان کی تصدیق خود قرآن مجید

اور بے شمار معتبر اور مستند روایات اور احادیث سے ہوتی ہے۔ اور اس کے برخلاف ایک بھی معتبر روایت نہیں پائی جاتی۔ قرآن مجید میں متعدد موقعوں پر اس واقعہ کا اظہار ہوا ہے کہ آنحضرت صلعم ظاہری تعلیم اور نوشت خواند کے داغ سے پاک تھے۔

چنانچہ سورہ اعراف کے انیسویں رکوع میں ارشاد ہوتا ہے اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ (یعنی وہ جو ہمارے ان ان پڑھ نبی رسول کی پیروی کرتے ہیں)

پھر اسی سورۃ میں ذرا آگے چل کر بیسویں رکوع میں حکم ہوتا ہے فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ (یعنی اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے ان پڑھ رسول نبی پر بھی)

پھر سورہ عنکبوت کے پانچویں رکوع میں فرمایا وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتَابٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ (یعنی اے پیغمبر قرآن سے پہلے نہ تو تم کوئی کتاب ہی پڑھتے پڑھاتے تھے اور نہ تم کو اپنے ہاتھ سے لکھنا ہی آتا تھا کیونکہ ایسا ہوتا تو یہ بے دین خواہی نخواہی شبہ کرتے)

مطلب یہ ہے کہ پیغمبر صاحب پڑھے لکھے تو تھے نہیں اس میں بھی خدا نے یہ مصلحت رکھی تھی کہ اگر پیغمبر صاحب پڑھے لکھے ہوتے تو منکر ضرور شبہ کرتے

یہ باتیں جو یہ شخص سمجھاتا ہی اس کی دیکھی بھالی ہوئی ہیں۔ اگلی کتابوں میں سے چن چناکر ایک قرآن بنالیا۔ مگر پیغمبر صاحب کے اُمّی ہونے کی وجہ سے یہ شبہ تو ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس پر بھی اگر انکار کریں تو اُن کی نری ہٹ دھرمی ہو۔

اسی طرح سورہ شوریٰ کے پانچویں رکوع میں دوہرایا گیا ہی مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ (یعنی تم نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا چیز ہی اور نہ یہ جانتے تھے کہ ایمان کس کو کہتے ہیں)

آنحضرتؐ ہمیشہ قریش کے مجمع میں رہے کبھی اُن کی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوئے۔ مکہ سے باہر بھی قریش کے جھرمٹ میں رہنا ہوا۔ اگر آپ نے ظاہری تعلیم پائی ہوتی تو شاعر، مجنون اور ساحر کی طرح وہ اس الزام کا بھی اظہار کرسکتے تھے۔ مگر انھوں نے ایسا کبھی نہیں کیا۔ اُن کو اس کا یقین تھا کہ محمدؐ کا سینہ ظاہری تعلیم کے عیب سے داغدار نہیں ہی ایک شبہ یہ تھا کہ محمدؐ کسی دوسرے سے سُن کر یہ قرآن پیش کرتے ہیں قرآن مجید نے اس اعتراض کو نقل کیا۔ اور اس کا جواب بھی دے دیا۔ سورہ نحل۔ رکوع ۱۴۔ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ؕ لِسَانُ الَّذِيْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِيٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ ۝ (یعنی۔ اے پیغمبر ہم کو تحقیق معلوم ہی کہ کافر قرآن کی نسبت یہ شبہ کرتے ہیں کہ ہو نہ ہو تم کو فلاں آدمی سکھایا کرتا ہی۔ سو جس شخص کی طرف سکھانے کی نسبت کرتے ہیں اس کی بولی تو عجمی ہی۔ اور یہ

قرآن صاف عربی زبان میں ہی) مطلب یہ کہ قرآن کی عبارت بڑی فصیح عربی ہے غیر ملک کا آدمی ایسی عمدہ عربی جان نہیں سکتا۔ تو وہ دوسرے کو کیا سکھائے گا۔ ایک نصرانی اپنی زبان میں انجیل پڑھا کرتا تھا۔ روایت یہ ہے کہ اس کی نسبت بعض لوگوں نے شبہ کیا کہ آنحضرت اس کی مدد سے قرآن تصنیف کرتے ہیں۔ خود قرآن مجید نے یہ شبہ قوی دلیل کے ساتھ دو رکر دیا۔

درحقیقت اگر آنحضرت کو لکھنا پڑھنا آتا ہوتا تو اُن کے صحابہ۔ رفقا اور متبعین اس بارہ میں ہرگز سکوت اختیار نہیں کرتے۔ اور اُن کے ازواج مطہرات اُن کے عزیز و اقربا اور بالخصوص اُن کے چچا جنھوں نے انھیں پالا تھا آپ کی تعلیم سے بے خبر نہیں رہ سکتے تھے۔ یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ جس دایہ نے آپ کو پالا تھا (یعنی حلیمہؓ) اس کے اور اس کے بیٹوں تک کے نام سے اور آنحضرتؐ کے غلام کے نام سے تو بچہ بچہ واقف ہو مگر جس اُستاد سے آنحضرتؐ نے تعلیم پائی تھی اور جس کے سامنے آپ نے زانوئے ادب تہ کیا تھا اُس کے نام سے دنیا یوں ناواقف رہتی۔ اور پھر آپ یہ جرأت کیوں کر فرما سکتے تھے کہ اپنے قبیلہ کے سامنے خلاف واقعہ اپنے آپ کو اُمّی فرماتے اگر آپ اُمّی نہ ہوتے تو قرآن مجید میں متعدد بار آپ کے لیے یہ لفظ استعمال ہونے پر مخالفین کو گرفت کا بہت آسان موقعہ ہاتھ آجاتا۔ اور ایسی حالت میں کلام الٰہی کی صداقت پر اُن کو ہرگز یقین نہ آتا۔

قطع نظر اس کے اس خفیف بات کے چھپانے سے جناب پیغمبر خدا کو کیا فائدہ تھا۔ اُن کا لکھا پڑھا ہونا منصب نبوت کے کسی طرح مخالف نہ تھا۔ اور نہ اس سے قرآن مجید کی شان اور اس کے معجزہ میں اور بے مثل فصاحت وبلاغت میں کچھ فرق آسکتا تھا۔ کیونکہ حروف کے لکھ پڑھ لینے سے انسان فصیح وبلیغ نہیں بن سکتا خصوصاً ایسا فصیح وبلیغ جس کا مثل بڑے بڑے فصحا میں سے کوئی بھی نہ تھا۔

اسلام کے مورّخوں میں سے کسی کو اس بات کا انکار نہیں کہ اس زمانہ میں فن تحریر عرب میں رائج تھا۔ اور کچھ لوگ لکھنا جانتے تھے اور دوسروں کا لکھا ہوا پڑھ سکتے تھے۔ اُس زمانہ کے بڑے بڑے شاعر اپنے قصیدوں کو خانہ کعبہ کے دروازوں اور دیواروں پر آویزاں کرتے تھے چنانچہ قصائد "سبعہ معلقہ" اسی نام سے مسلمانوں میں معروف ومشہور ہیں۔ اُن کا قول صرف اس قدر ہی کہ فن تحریر کا رواج تو تھا مگر بہت کم۔ لوگ اس کو جانتے تھے مگر بمقابلہ نہ جاننے والوں کے اُن کی تعداد بہت قلیل تھی۔

ریورینڈ جے۔ ایم۔ راڈویل صاحب جنھوں نے قرآن مجید کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہی (۱۸۶۱ء) اپنے ترجمہ کے دیباچہ میں فرماتے ہیں کہ

"ہمارے پاس اس امر کی کوئی شہادت نہیں ہی کہ ہمارے کتب مقدسہ کبھی محمدؐ کو دستیاب ہوگئی ہوں۔ گو یہ صرف ممکن ہی کہ عہد عتیق یا جدید

کے ٹکڑے خدیجہؓ یا اُن کے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل یا مکہ
اور عیسائیوں کے ذریعہ سے جن کے پاس ہماری مقدس کتاب کے
قلمی نسخے موجود ہوں اُس کے پاس پہونچ گئے ہوں اور یہ امر بھی
ذہن میں رکھنے کے قابل ہے کہ ہم کو کوئی صاف سُراغ اس امر
کا نہیں ملتا کہ کوئی عربی ترجمہ عہد عتیق یا جدید کا محمدؐ کے زمانہ سے پہلے
موجود تھا"

مشہور و معروف پادری ریورینڈ جان فنڈر صاحب نے اپنی کتاب میزان الحق
کے باب سوم میں تصریح کی ہے کہ

آنحضرت توریت اور انجیل پڑھے ہوئے نہ تھے یعنی زبان عبرانی
ایرانی وغیرہ سے جن میں توریت و انجیل منقول تھیں ناواقف تھے"

روایات میں بکثرت واقعات درج ہیں کہ یہود آپ کے پاس آتے تھے اور
آپ سے وہ سوالات کرتے تھے جو اُن کی کتابوں میں مذکور تھے جب آنحضرت
صلعم جواب دیتے تھے تو وہ متحیر رہ جاتے تھے۔ اگر یہود کو یہ یقین نہ ہوتا کہ آپ
اُمی ہیں تو ایسے سوالات کیوں کرتے۔ اور اگر سوالات کرتے بھی تو جواب
سُن کر یہ خیال کر لیتے کہ ہماری کتابوں کو پڑھ لیا ہے۔

ریورینڈ مسٹر بوسورتھ اسمتھ صاحب ایم۔ اے اپنی کتاب محمد
اینڈ محمد نزم" (صفحہ ۳۴۰) میں ارشاد فرماتے ہیں کہ

محمدؐ کو دینی اور دنیاوی دونوں قسم کی حکومتوں کی سرداری حاصل تھی اُن کے تنہا وجود میں "قیصر او۔ پوپ" دونوں شامل تھے لیکن وہ پوپ تھے بغیر فوق القدرت دعووں کے۔ اور قیصر تھے بغیر قیصری افواج کے"۔

"بغیر کسی مستقل فوج کے۔ بغیر کسی دستۂ محافظ (باڈی گارڈ) کے بغیر رہنے کے محل کے اور بغیر کسی معین آمدنی کے اگر کسی آدمی کو یہ کہنے کا حق تھا کہ "میں محض تائیدالٰہی سے حکومت کرتا ہوں" تو یہ دعوٰی صرف محمدؐ کو زیبا تھا کیونکہ اُن کو بغیر ظاہری وسائل کے اور بغیر کسی کی امداد کے ہر طرح کی طاقت حاصل تھی"۔

"بالکل لاثانی خوش قسمتی سے محمدؐ تین چیزوں کے بانی ہوئے ایک قوم کے بانی دوسرے ایک عظیم الشان سلطنت کے بانی اور تیسرے ایک مذہب کے بانی محمد خود تو اُمی تھے اور لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ مگر وہ ایک ایسی کتاب کے مصنف ہیں جو چار عناصر پر مشتمل ہے یعنی جو سرتا پا شعر ہے ایک مجموعہ ہے قوانین کا مجموعہ ہے دعاؤں کا۔ اور ساتھ ہی ایک بائیبل بھی ہے۔ اس کتاب کی اس وقت تک ساری دنیا کی کل آبادی کا چھٹا حصہ تعظیم کرتا ہے اور اس کے پاکیزہ اسلوب بیان اور اُس کی صداقت و ہدایت

کے لحاظ سے معجزہ تسلیم کرتا ہو۔ محمدؐ نے صرف اسی ایک معجزہ کا دعویٰ کیا وہ اس کو اپنا ابدی معجزہ قرار دیتے تھے۔ اور حقیقتاً یہ معجزہ ہی ہو لیکن زمانہ کے تقاضہ کا لحاظ کرتے ہوئے اور اُس انتہا درجہ کی تعظیم و تکریم اور جوشِ عقیدت کو پیش نظر رکھکر جو محمدؐ کے پیروؤں کے دلوں میں اپنے پیغمبر کی جانب سے ہو۔ ان کا ازمنۂ وسطیٰ کے مقدس پیشواؤں سے مقابلہ کرتے ہوئے میرے نزدیک محمدؐ میں سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ معلوم ہوتی ہو کہ اُنھوں نے معجزے دکھانے کا کبھی دعویٰ نہیں کیا۔ ان کے معتقدین نے البتہ اُن سے ایسے معجزات منسوب کئے جو اُن سے صادر نہیں ہوئے اور جن کے دکھانے سے وہ ہمیشہ انکار کرتے رہے۔ اس سے بلند تر اُن کے اخلاص کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہو۔"

محمدؐ نے آخر عمر تک اپنے لیے صرف اُسی ایک لقب کا دعوےٰ کیا جس کے ساتھ اُنھوں نے اپنا کام شروع کیا تھا۔ اور مجھے یقین ہو کہ ایک ایسا دن ضرور آئے گا کہ بلند ترین فلسفہ اور سچی عیسویت بھی اُن کو اس لقب کا مستحق سمجھے گی یعنی پیغمبر اور رسول خدا کا لقب۔"

ایک ضعیف روایت ہو کہ آنحضرتؐ کو آپ کے چچا ابوطالب اپنے ساتھ ملک شام کو لیئے جا رہے تھے۔ راستہ میں بحیرا نام ایک راہب نے آپ کو دیکھا اور

آثار سے پہچان لیا کہ یہ پیغمبر ہوں گے۔ چنانچہ اُس نے ابوطالب کو مشورہ دیا کہ
اُن کو مکہ واپس بھیج دو، ورنہ یہود قتل کر ڈالیں گے۔ عیسائی کہتے ہیں کہ پیغمبر
اسلام نے اسی راہب کی صحبت سے فیض حاصل کیا۔ اگر یہ صحیح ہو تو دنیا کے لیے
اس سے بڑھ کر معجزہ حضرت محمدؐ کا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ایک ابجد ناشناس طفل دوازدہ
سالہ نے چند گھنٹوں میں حقائق و اسرار دین، اصول عقائد، نکات اخلاق،
مہمات قانون اور ایک شریعت عظمےٰ کی تکمیل و تاسیس کے طریقے سب کچھ سیکھ
لیے۔ اور بحیرا کو کوئی جانتا بھی نہیں۔ آخر اگر کوئی سکھانے والا ہوتا تو مدعی نبوت
کی شہرت دیکھ کر وہ کیونکر پردہ گمنامی میں چھپا رہنا پسند کرتا۔ اور صحابہ کرام کی
نگاہوں سے اُس کا وجود ہمیشہ کیونکر مستور رہتا۔ اور ان کا عقیدہ کیوں کر
مستحکم رہ سکتا تھا۔ اور کفار اُس سے استفادہ ہی کیوں کرنے دیتے۔ اور وہ
خود ہی نبوت کا اعلان کیوں نہ کرتا۔

اب غور کا مقام ہے ایک امّی محض جو اُمیّوں ہی کی گودوں میں پلا
اور پل کر جوان ہوا۔ اُس نے ہوش سنبھالا تو گردوپیش تاریکیوں اور ظلمتوں کے
سوا اُس کو کچھ نظر نہیں آیا۔ علوم و فنون اور تمدّن و تہذیب سے ایک عاری
ملک۔ عاری شہر۔ عاری خاندان کے اندر نشو و نما پائی۔ جہاں اہل فکر اور ارباب
علم کا وجود نہ تھا۔ خود اُس کا خاندان اور اُس کا وطن نوشت و خواند کے
نقوش و حروف سے آشنا نہ تھا۔ گزشتہ صحف انبیا اور افکار عالیہ کا ایک

حرف اُس کے کان میں کبھی نہیں پڑا۔ علما اور دانش وروں کی صحبت اُس نے نہیں اُٹھائی۔ اصول قانون۔ مبادیِ اخلاق۔ اور محاسن علم و عمل کی کوئی تعلیم اُس کو نہیں ملی بلکہ مدرسۂ علم و حکمت کے سایۂ دیوار تک کبھی اُس کا گزر نہیں ہوا۔ اسی طرح وہ اپنی زندگی کے چالیس سال پورے کرتا ہے۔ کہ دفعتاً غارِ حرا کے دہانے سے اُجالا ہوتا ہے۔ علوم و فنون اور تہذیب و تمدّن کا سرچشمہ اُبلتا ہے۔ ظاہری نوشت و خواند کے نقوش و حروف کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے صحف انبیا اور اذکار عالیہ کے اوراق اُس کی زبان پر جاری ہوتے ہیں اُس کے پرتو صحبت سے اُمّی اور جاہل علمائے دہر اور دانشوران روزگار بن کر نکلنے لگتے ہیں۔ اصول قانون۔ مبادیِ اخلاق۔ اور محاسن علم و عمل کی تعلیم کا غلغلہ اُس کے بزمِ فیض کے گوشہ گوشہ سے بلند ہوتا ہے۔ کلام ربانی کے پردہ میں علم و حکمت کے پوشیدہ اسرار فاش ہونے لگتے ہیں اس سے زیادہ قرآن مجید کے معجز ہونے کی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے؟

پانچواں باب

قرآن مجید کی پیشین گوئیاں

۱۔ قرآن مجید کی ایک سورۃ کی برابر بھی کوئی دوسرا کلام کبھی پیش نہ کیا جاسکے گا

سورہ بقرہ تیسرے رکوع میں ارشاد ہوتا ہے

وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِنْ مِثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝ فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا وَلَنْ تَفْعَلُوا (ترجمہ) "اور وہ جو ہم نے اپنے بندے (محمد) پر (قرآن) اُتارا ہے۔ اگر تم کو اُس میں شک ہو (اور سمجھتے ہو کہ یہ کتاب خدا کی بنائی ہوئی نہیں بلکہ آدمی کی بنائی ہوئی ہے) اور (اپنے اس دعوے میں) سچے ہو تو اس جیسی ایک سورۃ (تم بھی) بنا لاؤ۔ اور اللہ کے سوا اپنے حمایتیوں کو بھی بُلا لو۔ پس اگر (اتنی بات بھی) نہ کرسکو اور ہرگز نہ کرسکو گے"

اس آیت شریف کا آخری حصّہ تاکیدی پیشین گوئی ہے جس میں نہایت وثوق کے ساتھ اعلان کیا گیا ہے کہ جو لوگ قرآن مجید کے کلام الٰہی ہونے میں شک کرتے ہیں وہ ہرگز اس جیسا تھوڑا سا کلام بھی کبھی پیش نہ کرسکیں گے۔ رسول خدا صلعم اپنی پیغمبری اور قرآن مجید کے کلام الٰہی ہونے کے

جو معیت سے دلائل پیش فرمایا کرتے تھے ان میں یہ پیشین گوئی سب سے زیادہ مستحکم دلیل تھی۔ ایک ان پڑھ پیغمبر کا مدعیان فصاحت و بلاغت سے پکار پکار کر یہ کہنا کہ تم لوگ ہرگز ایسا کلام نہ لاسکوگے بڑی وقیع پیشین گوئی تھی جو صحیح ثابت ہوئی اور تمام فصحا و بلغائے عرب اس جیسا کلام پیش کرنے سے عاجز رہے اور اپنے سکوت سے اپنے عجز کا صاف اعتراف کر لیا۔

۲۔ حفاظت کلام الٰہی کی پیشین گوئی۔

سورۂ الحجر کے پہلے رکوع میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ ۝ (ترجمہ) "بیشک ہم ہی نے قرآن اتارا ہے اور بیشک ہم ہی اس کے نگہبان ہیں"

حفاظت قرآن سے صاف یہ مراد ہے کہ اس میں کوئی کمی بیشی اور تغیر تبدل نہ ہو سکے گا۔ قرآن مجید کے حق میں یہ ایک کھلی ہوئی پیشین گوئی ہے اور کیسی عمدہ طور پر پوری ہو رہی ہے۔ خدا نے اپنے کلام کی حفاظت کا ایسا مستحکم انتظام فرمایا ہے جس کو قرآن کا معجزہ کہنا چاہیے کہ ہر ایک زمانہ میں ہزاروں لاکھوں مسلمانوں کو قرآن حفظ کرنے کا شوق رہا۔ اور اب بلا مبالغہ یہ کیفیت ہے کہ اگر خدا نخواستہ تمام روئے زمین سے مکتوبی قرآن معدوم ہو جائیں تو کوئی قطعۂ زمین ایسا نہیں ہے جہاں حافظ قرآن نہ ہوں اور ان کی یادداشت سے قرآن نہ لکھ لیا جائے اور کسی حالت میں قرآن کا ایک جملہ ایک لفظ

بلکہ ایک حرف بھی نہ ضایع ہو سکتا ہے۔ نہ بدلا جا سکتا ہے۔ اور جس قدر قرآن مختلف قطعات زمین میں اس طرح لکھے جائیں گے اُن میں باہم زیر وزبر کا بھی فرق نہ ہوگا۔ یہ ایک ایسا دعویٰ ہے جس کی صداقت دشمنوں تک کو مسلّم ہے اور جس کی کبھی اور کسی طرف سے تکذیب نہیں ہوئی۔

چنانچہ سر ولیم میور اپنی کتاب لائف آف محمدؐ میں لکھتے ہیں کہ "جہاں تک ہماری معلومات ہیں دنیا بھر میں ایک بھی ایسی کتاب نہیں جو اس (قرآن مجید) کی طرح بارہ صدیوں تک ہر قسم کی تحریف سے پاک رہی ہو"۔ نیز واقعات اس کے شاہد ہیں کہ اس کتاب کے پہلے دن سے لکھے جا کر بکثرت نسخے ہر قوم اور ملک میں شایع ہوئے اور آخر کار مشرق سے مغرب تک پھیل گئے اُن ہزار در ہزار قدیم ترین نسخوں میں ایک بھی نسخہ ایسا نہیں ملا اور نہ کبھی مل سکے گا جس میں ایک حرف یا زیر زبر کا فرق ہو۔

۴۔ کفار عرب کی شکست اور مسلمانوں کے غلبہ کی پیشین گوئیاں

(الف) وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ ۬ؕ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝ (سورۂ بقرہ رکوع ۱۴)

(ترجمہ) اور اس سے بڑھ کر ظالم کون جو اللہ کی مسجدوں (جن میں مسجد حرام یعنی خانہ کعبہ بھی شامل ہے) خدا کا نام لیئے جانے کو منع کرے اور ان کی بے رونقی کے درپے رہے۔ یہ لوگ خود اس لائق نہیں کہ مسجدوں میں آنے پائیں مگر ڈرتے ڈرتے۔ ان کے لیئے دنیا میں بھی رسوائی ہے اور ان کے لیئے آخرت میں بھی بڑا بھاری عذاب ہے۔ اور اللہ ہی کا ہے پورب اور پچھم تو جہاں کہیں (قبلہ کی طرف) منہ کر لو اُدھر ہی کو اللہ کا سامنا ہے۔ بے شک اللہ بڑی گنجایش والا اور سب کچھ جانتا ہے۔"

تاریخ اس کی شاہد ہے کہ ابتدائے اسلام میں پیغمبر صاحب اور اُن کے چند متبعین کو جو اُس وقت تھے خانہ کعبہ میں کفار اذان دینے اور نماز پڑھنے سے مانع ہوتے تھے۔ پیغمبر صاحب کے راستہ میں کانٹے انھوں نے بچھائے پیغمبر صاحب نماز پڑھ رہے ہیں زبردستی آکر لپٹ پڑے اور گلا گھونٹا۔ ایک بار سجدہ میں تھے کہ اونٹ کی اوجھڑی گردن پر رکھدی اور معمولی تکالیف تو آئے دن ہوتی رہتی تھیں۔ باوجودیکہ پیغمبر صاحب مسلمانوں کے ساتھ مکہ چھوڑ کر مدینہ جا بسے تھے اور ہجرت کے چھٹے برس عمرہ کرنے کے لیئے مکہ جانا چاہا کہ وہ بھی ایک قسم کا حج تھا۔ مکہ والوں نے آپ کو اور آپکے ہمراہیوں کو مکہ میں نہ آنے دیا۔ اس آیت میں کفار کے ان ہی مظالم کی طرف اشارہ ہے اور وہ جو پیشین گوئی کی تھی سو پوری ہو کر رہی۔ کہ انجام کار

خانۂ خدا پر مسلمان قابض ہو گئے اور کفار مارے ڈر کے بھاگے بھاگے پھرنے لگے۔

کفار جو مسلمانوں کو خانہ کعبہ میں نماز پڑھنے یا آنے سے منع کرتے تھے تو اس سے مسلمانوں کو ضرور بے دلی ہوئی ہو گی کہ خانۂ خدا میں ہم عبادت نہیں کر سکتے۔ اس آیت میں مسلمانوں کو تسلی دی گئی ہے کہ اس چندروزہ روک ٹوک سے تم کیوں بددل ہوتے ہو۔ نماز کچھ خانہ کعبہ پر ہی موقوف نہیں جہاں چاہے خدا کی عبادت کرو۔ تمام روئے زمین مسلمانوں کے لیے مسجد ہے کہیں بھی ہو قبلہ کی طرف نماز پڑھ لو۔ خدا قبول کرتا ہے۔

جس وقت یہ آیتیں نازل ہوئیں اس وقت دشمنان اسلام کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ آگے چل کر ان کی طاقت اور قوت کا خاتمہ ہو کر وہ مغلوب اور مقہور ہو جائیں گے۔

(ب) قُلْ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ (ترجمہ) "(اے پیغمبر) جو لوگ (دین اسلام سے) منکر ہیں ان سے کہدو کہ کوئی دن جاتا ہے کہ (مسلمانوں کے مقابلہ میں) تم مغلوب ہو گے"۔ (سورۂ آل عمران رکوع ۲) یہ پیشین گوئی اس زمانہ کی ہے کہ ابھی نبی کریم کی جمعیت ملک عرب میں دشمنوں کے مقابلہ میں کچھ بھی نہ تھی اور مخالفت صرف مشرکین عرب ہی کی طرف سے نہ تھی بلکہ اندرونی مخالف منافق اور بیرونی مخالف عرب کے سب مشرک اور یہود و نصاری اسلام کی

مخالفت پر کمر بستہ ہو چکے تھے۔ ان حالات میں ایسے صاف الفاظ میں کفار کی مغلوبیت کی پیشین گوئی کرنا اور اس پیشین گوئی کا آنحضرت صلعم کے سامنے پورا ہو جانا اسلام کی صداقت کا چمکتا ہوا نشان ہے۔

(ج) لَن يَضُرُّوكُمْ إِلَّا أَذًى ۖ وَإِن يُقَاتِلُوكُمْ يُوَلُّوكُمُ الْأَدْبَارَ ثُمَّ لَا يُنصَرُونَ ۝ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ (سورہ آل عمران رکوع ۱۲)

ترجمہ "(مسلمانو معمولی) ایذا دہی کے سوا وہ ہرگز تم کو کسی طرح کا (کوئی بڑا) نقصان نہیں پہونچا سکینگے۔ اور اگر تم سے لڑیں گے تو اُن کو تم سے پیٹھ پھیرتے ہی بن پڑے گی پھر (یہ بھی) اطمینان رکھو کہ ان کو (کہیں سے) مدد بھی نہیں ملے گی۔ جہاں دیکھو ذلت اُن (کے سر) پر سوار ہے۔

(د) وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۝ (سورہ آل عمران رکوع ۱۴)

ترجمہ" اور ہمت نہ ہارو (اور اس اتفاقی شکست سے) آزردہ خاطر ہو۔ اور اگر تم سچے) مسلمان ہو تو (آخر کار) تمہارا ہی بول بالا ہے۔

جنگ اُحد میں ستر مسلمان شہید ہو گئے تھے۔ اور بہت سی تکلیفیں اُن کو پہونچیں۔ اور یہ امر طبائع میں کچھ سستی اور کمزوری پیدا کر سکتا تھا۔ ان مسلمانوں کو غم بھی پہونچا تھا تو تقویت کے لئے فرمایا کہ جو وعدے تمہارے غلبہ کے ہیں وہ تو سچ ہو کر رہیں گے کیونکہ تم مومن ہو۔ اور ہلاکت کافروں کا

انجام ہے نہ کہ مومنوں کا۔

(۵) سَنُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ کَفَرُوا الرُّعْبَ (سورہ آل عمران رکوع ۱۶)

ترجمہ "گھبراؤ نہیں کیونکہ) ہم عنقریب تمہاری ہیبت کافروں کے دلوں میں بٹھا کر رہیں گے" احد کے میدان میں باوجود مسلمانوں کو اس قدر نقصان پہنچانے کے کفار مسلمانوں سے مرعوب رہے۔ اُن کو معلوم تھا کہ آنحضرتؐ زندہ ہیں۔ ابوبکرؓ اور عمرؓ بھی زندہ ہیں۔ ابوسفیان نے جب دیکھا کہ مسلمان آنحضرتؐ کے گرد جمع ہو گئے تو اُس نے بہتری اسی میں دیکھی کہ فوراً مکہ کی راہ لی۔ راستہ میں اُن کو اپنی اس حرکت پر ندامت بھی ہوئی کہ ہم بغیر قلع قمع کیے کیوں میدان چھوڑ آئے۔ مگر بوجہ رعب کے لوٹ نہ سکے بلکہ اُلٹا نبی کریمؐ نے اُن کا حمراء الاسد تک تعاقب کیا۔

(۶) فَعَسَی اللّٰهُ اَنْ یَّاْتِیَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَیُصْبِحُوْا عَلٰی مَآ اَسَرُّوْا فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِیْنَ (سورہ مائدہ رکوع ۸)

ترجمہ "سو کوئی دن جاتا ہے کہ اللہ (مسلمانوں کی) فتح یا اور کوئی امر اپنی طرف سے پیش لائے گا تو (اُس وقت یہ منافق) اُس (بدگمانی) پر جو (اسلام کے غلبے اور اُس کی صداقت کی نسبت) اپنے دل چھپاتے تھے پشیمان ہوں گے" منافقین مدینہ اس خوف سے کہ مسلمان بوجہ اپنی قلیل تعداد کے

مغلوب ہوں گے، یہودیوں اور کفار سے خفیہ تعلقات رکھتے تھے کہ ہم کسی طرح بچ جائیں۔

(ط) اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ لِیَصُدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَسَیُنْفِقُوْنَهَا ثُمَّ تَكُوْنُ عَلَیْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ یُغْلَبُوْنَ

(سورہ انفال رکوع ۴)

ترجمہ "اس میں شک نہیں کہ یہ کافر اپنے مال (اس لیے) خرچ کرتے رہتے ہیں تاکہ (لوگوں کو) راہ خدا سے روکیں سو یہ لوگ تو مال کو (اسی طرح پر) خرچ کرتے رہیں گے مگر پھر (آخرکار وہی مال) ان کے حق میں (موجب) حسرت ہوگا (خرچ بھی کریں گے اور) پھر مغلوب بھی ہوں گے۔"

(ی) وَلَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا سَبَقُوْا ؕ اِنَّهُمْ لَا یُعْجِزُوْنَ

(سورہ انفال رکوع ۸)

ترجمہ "اور کافر یہ نہ سمجھیں کہ (ہمارے قابو سے) نکل گئے۔ وہ ہرگز (ہم کو) ہرا نہیں سکتے۔" (یعنی کفر اسلام پر غالب نہیں آسکتا۔)

(ک) وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ؕ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِیْنَةِ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَیْنِ (سورہ توبہ رکوع ۱۳)

ترجمہ "اور (مسلمانو) تمہارے آس پاس کے دیہاتیوں میں سے (بعض)

منافق ہیں اور خود مدینہ کے رہنے والوں میں سے بھی جو نفاق پر اڑے بیٹھے ہیں (اے پیغمبر) تم ان کو نہیں جانتے ہم ان کو خوب جانتے ہیں سو جلدی ہی تو ہم (دنیا میں) ان کو دوہری مار دیں گے"۔

آپ جب ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے تو بعض لوگ منافق تھے۔ بظاہر ملے رہتے تھے بباطن کفار کے شریک تھے آنحضرت کو ان کے نام بتلا دیئے گئے۔ اور حضرت نے خطبہ میں اُن منافقوں کے نام لے کر مسجد سے نکال دیا نتیجہ یہ ہوا کہ اوّل تو مسلمانوں کی نظر میں بے اعتبار ہوئے۔ اور جب خدا نے پردہ کافروں کا ساتھ دیا تو کفار مغلوب ہو گئے غرض منافقین کی وہی حالت ہوئی۔ ازیں سو رانده و ازاں درمانده دوہری مار سے غالباً یہی مطلب ہے۔

(ل) وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِى اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِى الدُّنْيَا حَسَنَةً ؕ (سورہ النحل رکوع ۶)

ترجمہ۔ اور جن مسلمانوں پر (کافروں کی طرف سے) ظلم ہوئے اور ظلم ہوئے پیچھے اُن کو خدا کے لیے اپنے وطن چھوڑنے پڑے ہم اُن کو ضرور ضرور دنیا میں اچھے ٹھکانے سے بٹھائیں گے۔

مسلمانوں کے غلبہ کی پیشین گوئیوں میں سے ایک پیشین گوئی یہ بھی ہے جس کا وقوع ہو چکا۔ اس آیت میں جو ہجرت کا ذکر ہے تو اس میں

دونوں ہجرتوں کی طرف اشارہ سمجھنا چاہیئے پہلی ہجرت جو ملک حبش کی طرف ہوئی اور دوسری ہجرت مدینہ کی طرف ہوئی۔ مدینہ کی ہجرت بھی نبی کریم کے مکہ کی موجودگی ہی میں شروع ہو گئی تھی اور آپ نے سب سے آخر میں ہجرت کی۔ ان لوگوں کو جو اس بے سرو سامانی کے ساتھ اپنے گھروں سے نکلے اور جن کی کوئی بڑی تعداد نہ تھی اتنی بڑی بشارت کہ انھیں ہم دُنیا میں بھی اچھی جگہ دیں گے۔ قرآن کریم کی ان بے نظیر پیشین گوئیوں میں سے ایک ہی جن کے سامنے سخت سے سخت مخالف کو بھی سر جھکانا پڑتا ہے۔ یہ مکی صورت ہے۔ مکہ میں یہ اعلان ہوتا ہے اور اُن لوگوں کے متعلق جو کس مپرسی کی حالت میں کفار کے ہاتھ سے دُکھ اُٹھا کر بھاگے جا رہے ہیں۔ یہ آواز بلند اُن کے مخالفین کو سُنایا جاتا ہے کہ ان کا استیصال نہیں ہوگا جیسا کہ تم نے گمان کر لیا ہے بلکہ اُن کو دُنیا میں بھی بلند مقامات عطا ہوں گے۔ سارا ملک چند نفوس کے استیصال کے درپے تھا۔ یہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ یہ چند نفوس اس دنیا میں بھی اعلیٰ مقامات پر پہونچیں گے۔ اس قسم کی پیشین گوئیوں نے ملک عرب کو آنحضرت کے سامنے جھکا دیا۔

قرآن مجید کی جس قدر پیشین گوئیاں اوپر مذکور ہوئیں یہ سب اُس وقت ہوئیں جب مسلمانوں کی تعداد بہت تھوڑی تھی اور ظاہری اسباب کے لحاظ سے

ہی کو مسلمانوں کے غلبہ کا وہم و گمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ جب ہر طرف
ت کفار کا ہجوم تھا اور مسلمانوں کا مختصر گروہ بے کسی کی حالت میں تھا تو
پنی کثرت اور قوت کے بھروسہ پر کفار کو یقین تھا کہ ہم تمام مسلمانوں کا خاتمہ
کر دیں گے۔ تیرہ چودہ برس تک مسلسل مسلمانوں کو ستاتے رہے۔ اُن کو طرح
طرح کی ایذائیں اور تکلیفیں دیں اور مسلمان یہ تمام ایذائیں اور تکلیفیں اور
بے آبروئی اور بے حرمتی کی سختیاں برداشت کرتے رہے اور اُن کی تسلی
کے لیے اللہ تعالے نے اپنے نبی کی معرفت بار بار یہ اعلان کیا کہ عنقریب
تو مسلمان تمام عرب قبائل کی مخالفانہ قوتوں کا خاتمہ کر دیں گے چنانچہ آنحضرت
صلعم کے قلیل زمانۂ قیام مدینہ میں قرآن مجید کی یہ سب پیشین گوئیاں پوری ہوئیں
کفار کو شکستوں پر شکستیں اٹھانی پڑیں۔ اسلام اور مسلمانوں کو غلبہ ہوا اور آپ
ہی کی زندگی میں سارے ملک عرب میں اسلام کا بول بالا ہو گیا۔ اور کفر و
بت پرستی اپنی تمام برائیوں کے ساتھ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئی۔

یہ پیشین گوئیاں نجومیوں رمالوں اور جوتشیوں کی پیشین گوئیوں کی
طرح گول مول اور مبہم الفاظ میں نہ تھیں بلکہ کھلے کھلے الفاظ میں مسلمانوں
کو صاف صاف اطمینان دلایا گیا تھا کہ کوئی دن جاتا ہے کفار مغلوب ہوں گے
اور مسلمانوں کا غلبہ ہو گا۔ تاریخ اور واقعات شاہد ہیں اور ساری دنیا جانتی ہے
کہ مسلمانوں کی تعداد بہت قلیل تھی۔ سارا عرب اُن کی دشمنی پر تلا ہوا تھا۔ اور

وہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کا نام ونشان دنیا سے مٹا دیں آغاز نبوت کے بعد آنحضرتؐ کا قیام مکہ میں تیرہ برس رہا۔ مدینہ شریف ہجرت ہو چکی۔ دوسرے سال ہجری میں سب سے پہلے جنگ بدر پیش آتی ہے۔ مکہ سے ایک ہزار سے زیادہ کی تعداد میں مسلح ہو کر کفار اپنے بڑے بڑے سرداروں کی سرکردگی میں مدینہ پر چڑھائی کرتے ہیں۔ اُن کے مقابلہ میں اُس وقت مسلمانوں کی کل تعداد تین سو تیرہ میدان میں لائی جا سکی۔ اس وقت تک مسلمانوں کی یہی کل کائنات تھی۔ اُن کے پاس نہ سواری کے لیئے کافی اونٹ تھے نہ لڑنے کے لیئے پورے ہتھیار نہ رسد کا سامان۔ مگر تائید ایزدی اُن کے شامل حال تھی۔ یہی زمانہ ہے غلبہ اسلام کی پیشین گوئیاں پوری ہونا شروع ہوگئیں مسلمانوں کو شروع ہی سے ان الہامی پیشین گوئیوں پر کامل اعتماد اور یقین تھا۔ انھیں بشارتوں نے اُن کے دل قوی اور ارادے مضبوط رکھے۔ جو شخص ایک بار اسلام قبول کر لیتا تھا پھر اُس کو وحی اور الہامی خبروں پر پورا یقین ہوتا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ باوجود گوناگوں مصائب کے اُن کے قدم کبھی نہ ڈگمگائے اور وہ ہمت اور استقلال کے ساتھ غلبہ اسلام کے منتظر رہے۔

۴۔ فتح بدر کی پیشین گوئی۔ ہجرت کے بعد قریش کو مہلت نہ ملے گی

اَمْ يَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ ۵ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ

لُدُّبُرُ ہ (سورۃ القمر-رکوع ۲)

ترجمہ" یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہماری بڑی قومی جماعت ہے سو کوئی دن جاتا ہے (اُن کا) گروہ شکست کھائے گا۔ اور (مسلمانوں کے مقابلہ میں) پیٹھ پھیر پھیر کر بھاگیں گے" یہ آیت مکہ میں نبوت کے پانچویں چھٹے سال نازل ہوئی جو آنحضرتؐ کی تبلیغ کا ابھی بالکل ابتدائی زمانہ تھا۔ اُس وقت کسی کے وہم وگمان میں بھی یہ نہ آسکتا تھا کہ رسول خداؐ کے ساتھ کبھی اس قدر جمعیت ہوگی کہ وہ کفار کے مقابلہ میں جنگ کو نکلیں گے اور کفار کے لشکر کثیر کو جو سب ایک دوسرے کی مدد پر تلے ہوئے تھے شکست دے سکیں گے ایسی حالت میں جبکہ مسلمانوں کی کوئی بات بھی سننے والا نہ تھا

یہ کھلی ہوئی پیشین گوئی کہ مسلمانوں اور کفار میں جنگ ہوگی اور اس جنگ میں کفار شکست کھا جائیں گے اور پیٹھ پھیر پھیر کر بھاگیں گے اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور اس کے علم غیب کی گواہی دیتی ہے۔ آنحضرتؐ نے جس بے سروسامانی کے ساتھ ہجرت فرمائی تھی اُس حالت کو دیکھ کر کسی کے دل میں یہ خیال بھی نہ پیدا ہوسکتا تھا کہ یہ لٹے خانماں قافلہ ایک دن مدینہ سے اس قدر طاقتور ہوکر نکلے گا کہ جن لوگوں نے آغاز ہجرت تک اُن کی جان لینے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی تھی وہ اُس کے ہاتھوں خود ہلاک و برباد ہوجائیں گے لیکن قرآن مجید دوسری پیشین گوئی کر رہا تھا

چنانچہ یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی۔ اور ہجرت کے بعد ایک ہی سال کے اندر غزوۂ بدر نے سرداران قریش کا خاتمہ کر دیا اور ان کے نامی سردار مارے گئے۔ اور اہل عرب کی مخالفت کی جڑ کٹ گئی۔

صحیح بخاری میں منقول ہے کہ رسول خدا بدر کے دن خیمہ میں تھے اور ختم دعا کے بعد جب آپ باہر تشریف لائے تو زرہ پہنے ہوئے تھے اور آپ یہ آیت پڑھ رہے تھے سَیُهْزَمُ الْجَمْعُ وَیُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ اس وقت میں سمجھا کہ اس آیت میں آج (غزوۂ بدر) کی فتح کی پیشین گوئی ہے۔ چنانچہ یہ پیشین گوئی پوری ہوئی۔ اس جنگ میں کفر و اسلام ہی کا مقابلہ نہ تھا بلکہ عزیزوں۔ دوستوں۔ باپ اور بھائی یا موں اور چچا کے خلاف تلوار اٹھانی تھی مسلمان اس امتحان میں پورے اترے اور اللہ اور اللہ کے رسول کے مقابلہ میں انھوں نے کسی کی پروا نہیں کی۔ اللہ کی شان کہ تین سو آدمیوں کی چھوٹی سی بے سروسامان جماعت کو ایک ہزار بہادر سورماؤں کے مسلح لشکر پر ایسی زبردست فتح حاصل ہوئی۔ قریش کا خیال تھا کہ ان مٹھی بھر مسلمانوں کو دم بھر میں مسل کر رکھ دینگے مگر اللہ تعالے نے اُن کی ساری اکڑفوں اور غرور کو مٹی میں ملا دیا۔

جَلَّ جَلَالُہٗ

۵ مسلمانوں کو خلافت یعنی سلطنت عطا ہونے کی پیشین گوئی۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا (سورۃ النور۔ رکوع ۷)

ترجمہ "تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل بھی کرتے رہیں۔ اُن سے خدا کا وعدہ ہے کہ (ایک نہ ایک دن) اُن کو ملک کی خلافت (یعنی سلطنت) ضرور عنایت کرے گا۔ جیسے اُن لوگوں کو خلافت عنایت کی تھی جو ان سے پہلے ہو گزرے ہیں۔ اور جس دین کو اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے (یعنی اسلام) اُس کو ان کے لیے جما کر رہے گا۔ اور خوف خطر جو ان کو (لاحق) ہے اس کے بعد (عنقریب ہے) ان کو (اس کے) بدلے میں امن دے گا (کہ اطمینان) ہماری عبادت کیا کریں گے اور کسی چیز کو ہمارا شریک نہ گردانیں گے"

ایسی صاف اور مستحکم پیشین گوئی پیغمبر صاحب کی نبوت کی بڑی قوی دلیلوں میں سے ہے اُس کو پورا ہوتے ہوئے ساری دنیا نے دیکھ لیا۔ اس کی تصدیق کے لیے کسی ثبوت اور شہادت کی ضرورت نہیں۔ اس آیت میں تین وعدے صراحت کے ساتھ کیے گئے ہیں اول وعدہ خلافت یعنی

سلطنت۔ دوم تمکینِ دین۔ سوم خوف کی جگہ امن قایم کر دینا سیاق عبارت سے دوامِ خلافت مستنبط ہوتا ہے۔ یعنی بادشاہت مسلمانوں میں ہمیشہ رہے گی۔ بادشاہت میں ملک عرب کی بادشاہت تو امر لازم ہے اس لیے کہ وہ بادشاہت نبی کریم کو ملی۔ لہذا ضرور ہے کہ وہ مسلمانوں میں رہے۔ نیز دین اسلام کے قیام اور تمکین کے لئے اور اس کے ارکان کی حفاظت کے لیے بھی اس ملک کی بادشاہت کا مسلمانوں کے پاس رہنا ناگزیر ہے۔ وعدہ الٰہی سچا ہے۔

تمکین دین سے مراد دین کو ایسا مضبوط کر دینا کہ کوئی طاقت اس کو برباد نہ کر سکے۔

مسلمانوں کا گروہ ایک مظلوم بیکس اور ضعیف گروہ تھا جس کو کفار مکہ نے طرح طرح کی اذیتیں دے کر خانماں برباد کر دیا تھا۔ اس نے مدینہ میں آکر خدا کے نیک بندوں کے سایہ میں پناہ لی تھی۔ یہاں آکر بھی اس کو اطمینان اور راحت کی نیند نصیب نہ ہوئی۔ کفار مکہ تو پہلے ہی سے خون کے پیاسے تھے۔ مدینہ میں آکر دشمنوں کی تعداد میں منافقین اور یہود کا اور بھی اضافہ ہوگیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صحابہ کو ہمیشہ کفار کے حملہ کا خوف لگا رہتا تھا۔ اور ذرا سے شور و غل پر مدینہ میں جو ہی پھیل جاتی تھی۔ یہاں تک کہ صحابہ سوتے جاگتے مسلح رہتے تھے۔

چنانچہ اس مظلوم گروہ نے اس حالت سے تنگ آکر ایک دن رسولِ خدا سے عرض کیا کہ ہم کو دن رات ہتھیار بند رہنا پڑتا ہے۔ کیا کبھی وہ دن بھی آئے گا جب ہم کو اطمینان حاصل ہوگا۔ اور خدا کے سوا اور کسی کا ڈر نہ ہوگا۔ اس پر ان کو خدا نے قرآن مجید میں خلافت ارض یعنی دینی اور دنیاوی شہنشاہی کی بشارت دی اور وہ پوری ہوئی۔ اسلام کو استحکام میسر ہوا۔ اور اللہ تعالٰے نے خوف کی جگہ امن کر دیا۔ اس ضعیف گروہ نے آگے چل کر دنیا پر اس طرح کی کامیاب حکومت کی کہ اس کے سامنے متمدن حکومتوں کا شیرازہ بکھر گیا۔

یہ بشارت عظمٰے واقعات اور حالات گرد و پیش کے لحاظ سے کس قدر ناممکن معلوم ہوتی تھی۔ مگر چند ہی سال میں محال نے وقوع کی صورت اختیار کر لی۔

گوئٹے ایک مشہور جرمن فاضل نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ

> "اس کتاب (قرآن) کی اعانت سے عربوں نے سکندر اعظم کے جہان سے بڑا جہان اور رومۃ الکبریٰ کی سلطنت سے وسیع تر سلطنت فتح کر لی اور جس قدر زمانہ کہ سلطنت روما کو اپنی فتوحات کے حاصل کرنے میں درکار ہوا تھا اس کا دسواں

حصہ بھی اُن کو نہ لگا۔"

۶۔ فتح مکہ کی پیشین گوئی

قَاتِلُوهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِأَيْدِيكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُورَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِينَ ۝ وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوبِهِمْ ۚ

(سورۂ التوبہ رکوع ۲)

ترجمہ:"ان لوگوں سے بے تامل لڑو۔ خدا تمہارے ہی ہاتھوں ان کو سزا دے گا۔ اور ان کو رسوا کرے گا اور اُن پر تم کو فتح دے گا۔ اور مسلمانوں کے گروہ کے کلیجوں کو ٹھنڈا کرے گا اور ان کے دلوں میں جو (کافروں کی طرف سے) غصہ (بھرا ہوا) ہے اس کی خلش کو بھی دور کر دے گا"

اس سورۃ میں اس آیت سے پیشتر صلح حدیبیہ اور اس معاہدہ کا ذکر ہے جو کفار مکہ اور مسلمانوں کے درمیان ہوا تھا۔ یہ صلح فتح مکہ سے تین سال پیشتر کفار قریش اور مسلمانوں کے درمیان ہوئی تھی جس کا ذکر آگے آتا ہے۔ نیز کفار کی معاہدہ شکنی کا ذکر ہے جس کا نتیجہ جنگ ہوا اور مسلمانوں کو فتح عظیم نصیب ہوئی اور مکہ فتح ہو گیا۔ یہ پیشین گوئی جو اوپر نقل ہوئی اسی تذکرہ کے سلسلہ میں ہے لہذا یہ آیت بالاتفاق فتح مکہ کی پیشین گوئی تسلیم کی جاتی ہے۔

مسلمانوں کو فتح مکہ کی لو لگی ہوئی تھی یعنی اس شہر پر قبضہ جہاں سے وہ نہایت بے بسی اور بیکسی کے عالم میں نکلے تھے۔ اور جس کے حدود میں اُن کو قدم رکھنے کی اجازت نہ تھی۔ وہ گو اب مدینہ میں مقیم تھے مگر وطن کی یاد دلوا رہی ہوتی تھی۔ اُن کو فتح پر فتح ہوتی چلی جارہی تھی لیکن اُن کے دل کی کلی بھی شگفتگی کے لیے جس موسم بہار کا انتظار کر رہی تھی وہ ہنوز تنہا ہوں سے دور تھا مگر بشارت الٰہی قدم قدم پر اُن کی تسکین کے لیئے نیا پیام لا رہی تھی اور مژدہ فتح سے اُن کو شاد کرتی جاتی تھی۔

چنانچہ سورہ صف میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بشارت دی تھی۔

وَأُخْرَىٰ تُحِبُّونَهَا ۖ نَصْرٌ مِّنَ اللَّهِ وَفَتْحٌ قَرِيبٌ ۗ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ۝

(سورہ الصف رکوع ۲)

ترجمہ "(ایک اور نعمت بھی) ہے جس کو تم (دل سے) پسند کرتے ہو کہ خدا کی طرف سے (تم کو) مدد (ملے گی) اور تم عنقریب فتح پاؤ گے اور (اے پیغمبر) مسلمانوں کو (اس کی) خوشخبری سنا دو"

لَقَدْ صَدَقَ اللَّهُ رَسُولَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ ۖ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِن شَاءَ اللَّهُ آمِنِينَ مُحَلِّقِينَ رُءُوسَكُمْ وَمُقَصِّرِينَ لَا تَخَافُونَ ۖ (سورہ الفتح رکوع ۴)

ترجمہ:" بے شک اللہ نے اپنے رسول کو واقعی سچا ہی خواب دکھایا تھا کہ انشاء اللہ تم (مسلمان) مسجد حرام (خانہ کعبہ) میں بے خوف وخطر باطمینان تمام داخل ہو گئے (وہاں جاکر) تم (کچھ تو) اپنا سر منڈواؤگے اور (کچھ فقط) بال ہی کتر واؤگے۔"

ہجرت کے چھٹے برس صلح حدیبیہ سے پہلے آنحضرتؐ نے خواب میں دیکھا کہ مسلمان مسجد حرام (خانہ کعبہ) میں گئے اور وہاں احرام اُتارنے کے لیے کوئی بیٹھا سر منڈوا رہا ہے اور کوئی بال کتروا رہا ہے۔ اوپر کی آیت میں اللہ تعالیٰ نے آنحضرت کے اسی خواب کا ذکر فرمایا ہے۔ چونکہ سر منڈوانا یا بال کتروانا اعمال حج میں سے آخری عمل ہے تو خواب کا مطلب یہ ہوا کہ تم باطمینان تمام حج کروگے۔ مسلمانوں کو مکہ سے نکلے ہوئے کوئی چھ برس ہو گئے تھے کچھ تو وطن کی یاد کیونکہ بعض صحابہ کے بال بچے ابھی تک وطن ہی میں تھے کچھ عزیزوں کی محبت اور کچھ کعبہ کی زیارت کا شوق۔ غرض یہ لوگ مکہ جانے کے لیے بے چین تھے اُدھر انصار مدینہ بھی کافروں کے ڈرسے ہجرت کے بعد حج کو نہیں جاسکے تھے۔ وہ بھی اللہ کے گھر کی زیارت کے لیے بے تاب تھے۔ کچھ تو صحابہ کا یہ شوق اور بے تابی دیکھ کر اور کچھ اس خواب کی بنا پر آنحضرتؐ ذیقعدہ ۶ھ کی پہلی تاریخ عمرہ (زیارت وطواف کعبہ) کے ارادہ سے مدینہ سے روانہ ہوئے اور حدیبیہ کے مقام پر پہونچے جو مکہ سے نو میل کے فاصلہ پر ہے۔

چودہ سو کی تعداد میں مسلمان آپ کے ساتھ تھے۔ آپ نے قربانی کے لیئے بہت سے اونٹ بھی ساتھ لے لیئے تاکہ کافروں کو لڑائی کا شبہ نہ ہو۔ ہتھیاروں میں سوائے تلوار کے کوئی چیز ساتھ نہ تھی۔ کفار مکہ نے باوجود اس علم کے کہ سوائے زیارت وطواف بیت اللہ آپ کا اور کچھ منشا نہیں ہے حرم کی حد پر پہنچے ہوئے ۱۴۰۰ مسلمانوں کو داخلہ مکہ سے روک دیا لیکن جب قریش کو معلوم ہوا کہ مسلمان مرنے مارنے پر آمادہ ہیں تو سہیل بن عمرو کو سفیر بنا کر بھیجا۔ کافروں کا سب سے بڑا مطالبہ یہ تھا کہ مسلمان اس سال حج نہ کریں آخر بڑی ردوکد کے بعد صلح ہو گئی۔ اور صلح کی شرطیں یہ قرار پائیں (۱) مسلمان اس سال مکہ میں داخل نہ ہوں (۲) دوسرے سال آئیں اور صرف تین دن ٹھہر کر واپس چلے جائیں (۳) سوائے تلوار کے کوئی ہتھیار ساتھ نہ لائیں (۴) کوئی شخص کافر ہو یا مسلمان مدینہ سے مکہ آنا چاہے تو اجازت ہو گی مگر کوئی شخص مسلمان ہو کر مکہ سے مدینہ نہ جا سکیگا (۵) تمام قبیلوں کو آزادی ہو گی کہ وہ خواہ مسلمانوں سے معاہدہ کریں یا کافروں سے۔

اس صلح سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے دب کر صلح کی ہے مسلمانوں کو یہ بات بہت ناگوار گزری حضرت عمرؓ نے عرض کیا کیا آپ نبی نہیں ہیں آپ نے فرمایا بے شک ہوں۔ حضرت عمر نے پوچھا کیا ہم حق پر ہیں۔ فرمایا

ترجمہ۔ بے شک اللہ نے اپنے رسول کو واقعی سچا ہی خواب دکھایا تھا کہ انشاء اللہ تم (مسلمان) مسجد حرام (خانہ کعبہ) میں بے خوف وخطر باطمینان تمام داخل ہو گے (وہاں جاکر) تم (کچھ تو) اپنا سر منڈواؤگے اور (کچھ فقط) بال ہی کترواؤگے۔"

ہجرت کے چھٹے برس صلح حدیبیہ سے پہلے آنحضرتؐ نے خواب میں دیکھا کہ مسلمان مسجد حرام (خانہ کعبہ) میں گئے اور وہاں احرام اُتارنے کے لئے کوئی بیٹھا سر منڈوا رہا ہے اور کوئی بال کتروا رہا ہے۔ اوپر کی آیت میں اللہ تعالیٰ نے آنحضرتؐ کے اسی خواب کا ذکر فرمایا ہے۔ چونکہ سر منڈوانا یا کتروانا اعمال حج میں سے آخری عمل ہے تو خواب کا مطلب یہ ہوا کہ تم باطمینان تمام حج کروگے۔ مسلمانوں کو مکہ سے نکلے ہوئے کوئی چھ برس ہو گئے تھے کچھ تو وطن کی یاد کیونکہ بعض صحابہ کے بال بچے ابھی تک وطن ہی میں تھے کچھ عزیزوں کی محبت اور کچھ کعبہ کی زیارت کا شوق۔ غرض یہ لوگ مکہ جانے کے لیے بے چین تھے اُدھر انصار مدینہ بھی کافروں کے ڈر سے ہجرت کے بعد حج کو نہیں جا سکے تھے۔ وہ بھی اللہ کے گھر کی زیارت کے لیے بے تاب تھے۔ کچھ تو صحابہ کا یہ شوق اور بے تابی دیکھ کر اور کچھ اس خواب کی بنا پر آنحضرتؐ ذیقعدہ ۶ھ کی پہلی تاریخ عمرہ (زیارت وطواف کعبہ) کے ارادہ سے مدینہ سے روانہ ہوئے اور حدیبیہ کے مقام پر پہونچے جو مکّہ سے نو میل کے فاصلہ پر ہے۔

چودہ سو کی تعداد میں مسلمان آپ کے ساتھ تھے۔ آپ نے قربانی کے لیئے
بہت سے اونٹ بھی ساتھ لے لیئے تاکہ کافروں کو لڑائی کا شبہ نہ ہو۔
ہتھیاروں میں سوائے تلوار کے کوئی چیز ساتھ نہ تھی۔ کفار مکہ نے باوجود
اس علم کے کہ سوائے زیارت وطواف بیت اللہ آپ کا اور کچھ منشاء نہیں
حرم کی حد پر پہونچے ہوئے ۱۴۰۰ مسلمانوں کو داخلہ مکہ سے روک دیا لیکن
جب قریش کو معلوم ہوا کہ مسلمان مرنے مارنے پر آمادہ ہیں تو سہیل بن
عمرو کو سفیر بنا کر بھیجا۔ کافروں کا سب سے بڑا مطالبہ یہ تھا کہ مسلمان اس
سال حج نہ کریں آخر بڑی ردوکد کے بعد صلح ہو گئی۔ اور صلح کی شرطیں یہ
قرار پائیں (۱) مسلمان اس سال مکہ میں داخل نہ ہوں (۲) دوسرے سال
آئیں اور صرف تین دن ٹھہر کر واپس چلے جائیں (۳) سوائے تلوار کے
کوئی ہتھیار ساتھ نہ لائیں (۴) کوئی شخص کافر ہو یا مسلمان مدینہ سے
مکہ آنا چاہے تو اجازت ہو گی مگر کوئی شخص مسلمان ہو کر مکہ سے مدینہ نہ جا سکیگا
(۵) تمام قبیلوں کو آزادی ہو گی کہ وہ خواہ مسلمانوں سے معاہدہ کریں یا
کافروں سے۔

اس صلح سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے دب کر صلح کی ہے مسلمانوں
کو یہ بات بہت ناگوار گزری حضرت عمرؓ نے عرض کیا کیا آپ نبی نہیں ہیں
آپ نے فرمایا بے شک ہوں۔ حضرت عمر نے پوچھا کیا ہم حق پر ہیں۔ فرمایا

ہاں حق پر ہیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ پھر ہم دین کے معاملہ میں دب کر کیوں صلح کریں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ یہ جو کچھ ہوا ہے خدا کے حکم کے مطابق ہوا ہے۔

اس صلح حدیبیہ کے بعد آپ نے مدینہ کی طرف واپسی کا قصد فرمایا۔ صلح کے دو روز بعد یہ آیت نازل ہوئی اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۝ (سورۂ فتح رکوع ۱) یعنی ہم نے کھلی فتح تم کو دی۔ آپ نے اسی وقت حضرت عمرؓ کو بلوا کر یہ خوشخبری سنائی جس سے مسلمانوں کے سارے غم اور پریشانیاں دور ہو گئیں۔ اور دو برس بعد مکہ فتح ہو گیا۔ تمام مفسرین کی بالاتفاق رائے ہے کہ یہ فتح مکہ کی بشارت ہے جس کا آگے چل کر ظہور ہوا اس فتح کے مسلمان سب سے زیادہ منتظر تھے۔ اس کے بعد سورۂ توبہ میں جو مدینہ شریف میں سب سے آخر نازل ہوئی ارشاد ہوا۔

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا ۝ (سورۂ توبہ رکوع ۴)

ترجمہ: مسلمانو مشرک تو (نرے) گندے ہیں تو اس برس کے بعد حرمت والی مسجد (خانۂ کعبہ) کے پاس بھی نہ پھٹکنے پائیں گے۔ اس سے زیادہ صاف اور کیا پیشین گوئی ہو سکتی ہے چنانچہ اگلے سال مکہ فتح ہو گیا۔

مکہ میں داخلہ کے بعد آپ نے سب سے پہلے خانہ کعبہ کو تین سو ساٹھ ۳۶۰

بتوں کی نجاست سے پاک کیا اور تمام بت نکلوا کر پھنکوا دیئے۔ اور دیواروں پر جو انبیاء اور رسولوں کی تصویریں بنی ہوئی تھیں انہیں مٹا دیا۔ جب پوری صفائی ہو گئی تو آپ نے نماز پڑھی اور خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے اپنے وعدہ کے مطابق مسلمانوں کو اپنے گھر پر قبضہ دلا دیا۔ جو اس کے صحیح حقدار تھے۔ مکہ میں آپ پندرہ دن ٹھیرے۔ اس عرصہ میں مکہ کے مردوں اور عورتوں کی بہت بڑی تعداد نے اسلام قبول کر لیا۔ اور خانہ کعبہ پر سے کفار کا قبضہ بالکل اٹھ گیا اور مذکورہ بالا قرآن مجید کی پیشین گوئی پوری ہو گئی۔

۷۔ غلبہ روم کی پیشین گوئی

الٓمّٓ۔ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۙ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۙ فِیْ بِضْعِ سِنِيْنَ ۛ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ ۚ وَيَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ بِنَصْرِ اللّٰهِ ۚ يَنْصُرُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۙ وَعْدَ اللّٰهِ ۚ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ (سورہ روم رکوع ۱)

ترجمہ۔ قریب کے ملک (یعنی عراق) میں رومی (جو نصاریٰ ہیں) اہل فارس سے (جو آتش پرست ہیں) مغلوب ہو گئے ہیں لیکن یہ لوگ اپنے مغلوب ہوئے پیچھے عنقریب چند سال میں (پھر اہل فارس پر) غالب آ جائیں گے (اس سے) پہلے بھی (فتح و شکست کا) اختیار اللہ ہی کو تھا اور (اس وقت

کے) بعد بھی (اُسی کو اختیار ہے) اور اُس دن (جبکہ رومی غالب ہوں گے)
مسلمان اللہ کی مدد سے خوش ہو جائیں گے وہ جس کی چاہے مدد کرتا ہے
اور وہ زبردست اور رحم والا ہے۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے اور اللہ اپنے
وعدہ کے خلاف نہیں کیا کرتا۔"

"اَدۡنَی الۡاَرۡضِ" کے لفظی معنے ہیں۔ قریب سرزمین کے۔ عرب کے شمال
میں عرب سے ملحق شام و فلسطین کی سرزمین ہے اور مشرق میں عراق
و فارس کے حدود عرب سے ملتے ہیں۔ عراق۔ شام اور فلسطین ہرقل
شاہ روم کے قبضہ میں تھے۔ ایرانی افواج نے عراق پر یورش کرکے دمشق
اور بیت المقدس کو بھی فتح کرلیا اور صلیب مقدس کو لے گئے۔ یہ رومیوں
(عیسائیوں) کی انتہائی مغلوبیت تھی۔

بِضۡعِ سِنِیۡنَ (چند سال) محاورہ عرب کے مطابق اس چند سال
کی میعاد تین سال سے نو سال تک ہے یعنی بضع سنین کی انتہائی
میعاد نو سال ہے۔

آنحضرت صلعم کے عہد میں ممالک روم (ایشیائے کوچک
ملک شام و فلسطین و آرمینیا وغیرہ) نصاریٰ کے قبضہ میں تھی اور شاہ
روم ہرقل تھا۔ ملک فارس پر آتش پرست مسلط تھے اور خسرو ثانی بادشاہ
تھا۔

رومیوں اور عیسائیوں میں لڑائی ہوئی اگرچہ یہ لڑائی عراق میں شروع ہوئی تھی جو عرب سے خارج اور اس کی سرحد پر واقع ہے اور عرب کو اس جنگ سے کچھ تعلق نہ تھا مگر تاہم مسلمان چاہتے تھے کہ رومیوں کا غلبہ ہو کیونکہ وہ اہل کتاب ہیں۔ اور مشرکین عرب اہل فارس کی خیر مناتے تھے کیونکہ وہ بھی ایک طرح کے بت پرست تھے۔ اتفاق سے اہل فارس کی فتح ہوئی تو مشرکین عرب بہت خوش ہوئے اور مسلمانوں پر آوازے کسنے لگے۔

ان آیتوں میں خدا نے کئی سال پہلے بتا دیا کہ گو اس وقت رومی مغلوب ہوگئے ہیں مگر وہ چند سال بعد اہل فارس پر فتح پائینگے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور یہ واقعہ تاریخی پیشین گوئی کا بڑا زبردست معجزہ ہے۔

دو زبردست سلطنتوں کے بارہ میں برسوں پہلے ایک قطعی فیصلہ وثوق کے ساتھ کر دینا کسی بشر کا کام نہیں اور پیغمبر صاحب کو تو ان دونوں سلطنتوں کی فوجی قوت اور انتظام کے جانچنے کا کبھی موقعہ ہی نہ ملا۔ اس پیشین گوئی کے مطابق جو وقت رومیوں کے ایرانیوں پر غلبہ پانے کا ہے وہی مسلمانوں کے اپنے دشمنوں پر غلبہ کا ہے۔ اور دونوں کو اکٹھا کرنے کی یہ وجہ ہے کہ اس پیشین گوئی کے وقت دونوں قومیں رومی اور مسلمان مغلوب تھیں اور مغلوب بھی ایسی کہ ان کے اٹھنے اور ایک طاقتور دشمن پر غالب آنے کا خفیف سے خفیف بھی قرینہ نہ تھا۔

یہ سورۃ بالاتفاق مکی ہے مکہ میں نازل ہوئی اس کا نزول یقین کے ساتھ پانچواں سال نبوت ہے۔ یہی وہ وقت ہے جبکہ رومیوں کی مغلوبیت انتہا کو پہونچ چکی تھی اور اہل فارس نے ان کے تمام صوبے یکے بعد دیگرے فتح کر لیئے تھے اس پیشین گوئی کے بعد آنحضرتؐ سات آٹھ سال مکہ میں رہے اور ایک سال مدینہ کے قیام کے بعد مسلمانوں کو بدر کی فتح نصیب ہوئی یہی وہ وقت تھا جب رومی از سر نو فارس پر غالب آئے سلطنت روما اور اہل فارس کا عرصہ سے مقابلہ چلا آتا تھا سنہ ۶۰۲ عیسوی میں وہ عظیم الشان جنگ چھڑ گئی جس کا اوپر کی آیت میں ذکر ہے۔ اور سنہ ۶۱۵ عیسوی میں ایرانی جرنیل نے دمشق اور یروشلم کو فتح کیا اور رومی اس کا مقابلہ نہ کر سکے (انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا)

ایک ایسی لمبی جنگ کے بعد جو تیرہ سال جاری رہی سلطنت ایران سلطنت روما پر غالب آجاتی ہے۔ اس کا صوبہ پر صوبہ لیئے چلی جاتی ہے یہاں تک کہ کل صوبجات کو لیکر دارالخلافہ کے دروازہ پر جا پہونچتی ہے ایسے وقت میں یہ پیشین گوئی کہ مغلوب سلطنت زیادہ سے زیادہ نو سال میں غالب آجائے گی قیاس و قرائن کے سراسر خلاف تھی اسی پر بس نہیں بلکہ ساتھ ہی ایک بظاہر ایسی ناممکن الوقوع بات اور بتلادی کہ عین اُسی وقت جبکہ رومی ایرانیوں پر نو سال کے اندر غالب آئینگے مسلمان بھی مشرکین پر

غالب آجائینگے۔ حالانکہ مسلمانوں کی اس وقت کوئی جماعت بھی نہیں تھی جس کے غالب آنے کا وہم وگمان بھی کسی کو ہو سکے لیکن قدرت خداوندی کا کرشمہ کہ ایک ہی سال یعنی ۶۲۴ عیسوی میں ہرقل نہ صرف اپنے علاقے واپس لے لیتا ہے بلکہ ایران کے اندر داخل ہوکر ان کے بڑے آتش کدے کو تباہ کر دیتا ہے اور اسی سال ۳۱۳ مسلمان جن کے پاس ہتھیار نہیں، ور جو جنگ آزمودہ نہیں ایک ہزار قریش کی مسلح جمعیت پر غالب آجاتے ہیں (فتح بدر)

(نوٹ۔ ۶۱۵ء میں ایران نے روم پر فتح کامل پائی اور نو برس پورے نہ ہوئے تھے کہ ۶۲۴ء میں رومیوں نے از سر نو فارس پر غلبہ پایا۔)

ایسی عظیم الشان پیشین گوئی سن کر عرب خاموش نہ رہ سکتے تھے۔ ابی بن خلف نے شدومد سے انکار کیا۔ کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ حضرت ابوبکرؓ نے جن کا ایمان وحی پر پہاڑ کی طرح مضبوط تھا اس پر شرط لگائی کہ اگر تین سال میں اہل روم غالب نہ آئے تو دس اونٹ میں دونگا اور اگر غالب آگئے تو دس اونٹ تم سے لونگا۔ آنحضرتؐ کو جب یہ علم ہوا تو آپ نے حضرت ابوبکر سے فرمایا کہ "بضع سنین" کا لفظ نو برس تک کے لئے آتا ہے۔ لہذا میعاد اور شرط دونوں بڑھا دو۔ ابی بن خلف نے اس کو منظور کر لیا اور شرط ٹھہری کہ اگر نو سال کے اندر رومیوں نے ایران کو مغلوب نہ کیا تو حضرت ابوبکر ایک سو اونٹ ابی کو دیں ورنہ اس سے ایک سو اونٹ لے لیں۔ چنانچہ

احادیث میں مذکور ہے کہ جب بدر کا واقعہ ہوا تو رومی ایرانیوں پر غالب آ گئے اور ابوبکرؓ نے اُبیّ کے وارثوں سے حسب قرار داد سو اونٹ لیے اور آنحضرتؐ کے پاس لائے آپ نے ارشاد فرمایا کہ صدقہ کر دو۔ غرض یہ پیشین گوئی کفار میں بہت شہرت پا چکی تھی اور اس کا پورا ہونا بھی ان پر اچھی طرح ظاہر ہو گیا تھا۔ اس پیشین گوئی کے اس طرح پورے ہونے پر بہت سے قریش مسلمان ہو گئے

اس واقعہ کے ساڑھے بارہ سو برس کے بعد تاریخ زوال سلطنت روما کا مشہور مصنف ایڈورڈ گبن اس حیرت ناک پیشین گوئی کی صداقت سے متحیر ہو کر لکھتا ہے۔

"مشرق کی ان دو عظیم الشان سلطنتوں کے ڈانڈے پر بیٹھ کر ان دونوں کی ایک دوسرے کو تباہ کرنے والی روزافزوں کوششوں کی ترقی کو دلی مسرت کے ساتھ بغور مطالعہ کر رہا تھا (آنحضرتؐ کی طرف اشارہ ہے) اور عین اس وقت جبکہ ایرانیوں کو پیہم کامیابیاں حاصل ہو رہی تھیں اس نے اس پیشین گوئی کی جرأت کی کہ چند سال میں فتح و ظفر رومی علم پر سایہ افگن ہوں گے۔ جس وقت یہ پیشین گوئی کی گئی تھی کوئی پیشین گوئی اس سے زیادہ دور از قیاس نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ ہرقل کے بارہ سال یعنی ۶۱۰ء سے ۶۲۲ء تک کے حکومت نے اس بات کا اعلان کر دیا تھا کہ رومی شہنشاہی کا شیرازہ

جلد بکھر جائے گا۔"

(نوٹ یعنی ہرقل نہایت کاہل آرام طلب اور عیش پرست بادشاہ تھا جس کو انتظام سلطنت کی طرف بالکل توجہ نہ تھی لہذا بظاہر سب آثار زوال سلطنت کے تھے۔ مؤلف) تاریخ زوال روم جلد سوم صفحہ ۳۰۲)

آنحضرتؐ نے اپنی الہامی زبان میں جن واقعات کی پیشین گوئی کی ہے اُن سب میں سب سے زیادہ شاندار سب سے زیادہ صاف وصریح اور سب سے زیادہ معرکۃ الآراء غلبہ روم کی پیشین گوئی تھی۔ یہ پیشین گوئی دنیا کا عظیم ترین معجزہ ہے۔ اپنی صفائی کے لحاظ سے آنحضرتؐ کا یہ معجزہ قیامت تک آپ کی رسالت کی تصدیق کرنے کے لیے کافی ہے۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلِّمْ۔



چھٹا باب

قرآن مجید کی تعلیم اور ہدایت

اس باب میں قرآن مجید کی معنوی خوبیوں اور باطنی کمالات کا ذکر ہوگا تاکہ معلوم ہو کہ اس کلام پاک نے بنی آدم کی روحانی اور خلاقی تعلیم و تربیت اور اصلاح و ترقی تمدن میں کیا کیا کرشمے دکھائے اور کیسے دایم الاثر نتیجے پیدا کیئے جو اس امر کے ثابت کرنے کو کافی ہیں کہ جس کلام کے وہ نتیجے ہیں وہ بے شک وشبہ کلام الہٰی ہی اور ممکن نہیں ہی کہ بغیر تائید وحی و الہام کے انسان ویسا کلام کر سکے جس کے نتیجے ایسے عظیم الشان اور دائم الاثر ہوں۔

جس زمانہ میں قرآن مجید نازل ہوا دنیا ایک عجیب روحانی سکتہ میں مبتلا تھی۔ توحید ذات و صفات باری تعالے اور خالص خدا پرستی کو تقریباً سب لوگ بھولے ہوئے تھے۔ اور طرح طرح کے فاسد عقیدے اور غلط رائیں اور باطل پرستشیں اختیار کر رکھی تھیں۔ کوئی خدائے واحد کے مقابل دو وجود نور و ظلمت یا یزدان و اہرمن کو قایم کر کے نیکی اور بدی کے اختیارات اُن میں تقسیم کرتا تھا۔ کوئی چاند اور سورج وغیرہ ستاروں کے نور و ضیا کا فریفتہ تھا

وہ اُن کو نور خدا بلکہ خدا سمجھ کر اُن کے آگے سر جھکاتا تھا۔ کوئی آتش پرستی میں سرگرم تھا اور آگ کو معبود حقیقی سمجھ کر اُس سے لو لگائے ہوئے تھا کوئی پہاڑوں دریاؤں اور جھیلوں کی محبت و عقیدت میں ڈوبا ہوا تھا۔ کوئی ان گھڑ پتھروں کو خدا سمجھ کر دنیا و آخرت کی توقع پر اُن کے سامنے پیشانی رگڑتا تھا۔ کوئی نیچر یعنی طبیعت ہی کو خالق اشیا سمجھتا تھا اور خالق نیچر سے بے خبر اور اس کا منکر تھا۔ بعض قومیں جو خدا پرستی کا دم بھرتی تھیں اور اپنے کو خالص خدا کا بندہ بتلاتی تھیں اُن کی حالت سب سے خراب تھی۔ چنانچہ یہودی جہاں جہاں پہونچے غیر قوموں کے مذہبی خیالات اور اعتقادات سے متاثر ہونے سے نہ بچ سکے۔ ان میں سے جو عرب پہونچکر آباد ہوئے مشرکین مکہ کی بُت پرستی نے اُن پر ایسا اثر کیا کہ وہ اُنھیں کے رنگ میں رنگے گئے۔ یہ باور کرنے کے معقول وجوہ ہیں کہ کعبہ کی دیواروں پر جو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ وغیرہ کی تصویریں بنی ہوئی تھیں اور جن کو فتح مکہ کے دن آنحضرتؐ کے حکم سے مٹا یا گیا وہ سب یہودیوں کی بنائی ہوئی تھیں نیز خانہ کعبہ میں حضرت نوحؑ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ کی جو مورتیں موجود تھیں اُن کا وجود بھی یہودیوں کے مذہب سے وابستہ تھا۔ عیسائیوں کے عقاید میں بھی فرق آگیا تھا حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا بلکہ پورا خدا سمجھنے لگے۔ اور نہایت ذلیل بت پرستی نے خدائے واحد کی اُس سادہ پرستش کی جگہ چھین لی تھی جس کی حضرت عیسیٰؑ

نے ہدایت کی تھی۔ خلاصہ یہ کہ اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ بھی اپنے مذہب کی بڑی اصل یعنی اللہ تعالیٰ کے خالص پرستش کو بھول گئے تھے۔ اور سوءِ عقائد اور بدعتوں کے لحاظ سے اپنے بت پرست معاصرین کے مساوی تھے عرب کی حالت سب سے بدتر تھی۔ وہ گویا سب ملکوں کی بے دینی کا نمونہ اور مجموعہ تھا۔ اور نہایت ناشائستہ اور ذلیل فسق و فجور اور اخلاقی اور تمدنی پستی میں مبتلا تھا۔ مشرکین اور تمام اہل عرب ایک جاہل لٹیری و خونخوار خانہ بدوش قوم تھی جس میں ذرا ذرا سی باتوں پر ہمیشہ خونریزیاں ہوا کرتی تھیں۔ مثلاً وہ لڑائی جو اشعار عرب میں حرب بسوس کے نام سے مشہور ہے چالیس برس تک جاری رہی اور اس میں اول سے آخر تک ستر ہزار آدمی مارے گئے۔ اس کی بنیاد صرف یہ تھی کہ قبیلہ بنی تغلب میں بسوس نام ایک عورت تھی اس کے ایک مہمان کی اونٹنی قبیلہ بنی بکر کے ایک شخص کی چراگاہ میں چلی گئی اور اس شخص نے اس اونٹنی کے تھن کاٹ ڈالے۔ اس بات پر بنی تغلب اور بنی بکر دونوں قبیلوں میں لڑائی ٹھن گئی اور چالیس برس تک اس کا سلسلہ جاری رہا۔ اسی طرح ایک دوسری لڑائی جو حرب داحس کے نام سے مشہور ہے وہ ۳۰ برس جاری رہی۔ اس کا سبب بھی صرف اتنی سی بات تھی کہ داحس نامی ایک گھوڑا گھڑدوڑ میں آگے بڑھنا چاہتا تھا کہ ایک شخص نے آگے بڑھ کے اس کو بدکا دیا۔ اس پر وہ رن پڑے

قبیلے کے قبیلے پامال ہوگئے۔ کینہ و قساوت کا یہ حال تھا کہ عورتیں اپنے زخمی اور مقتول دشمنوں کا کلیجہ نکال کر دانتوں سے چباتیں اور اُن کے ناک کان اور شرمگاہیں کاٹ کر ڈوسے میں پرو کر کمال بے شرمی سے ہار اور پہنچیوں کی طرح گلے اور ہاتھوں میں پہنتی تھیں۔ چوری اور قزاقی میں یگانہ تھے سب سے زیادہ وحشیانہ اور ہولناک رسم جس کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں اُن میں یہ جاری تھی کہ معصوم بچوں کو ذبح کرکے بتوں پر بھینٹ چڑھایا کرتے تھے اور غریب بے زبان لڑکیوں کو شوہر کہلانے کی شرم سے یا افلاس کے ڈر سے کبھی تو پیدا ہوتے ہی اُن کا گلا گھونٹ دیتے تھے۔ یا زمین میں زندہ دفن کر دیتے تھے۔ اور کبھی پہاڑ سے لڑھکا کر اور کبھی پانی میں ڈبو کر مار ڈالتے تھے۔ اور کبھی ذبح بھی کر ڈالتے تھے۔ لونڈیوں اور غلاموں کے ساتھ نہایت بدسلوکی سے پیش آتے تھے اُن سے سخت سخت محنتیں کراتے تھے اور بُرے سے بُرا کھانا کھانے کو اور ناقص سے ناقص کپڑا پہننے کو دیتے تھے۔ غرض اُن کے نزدیک لونڈی اور غلاموں کی حقیقت بھیڑ بکری سے زیادہ نہ تھی۔

حرام کاری۔ بے حیائی اور بے غیرتی کی یہ نوبت تھی کہ کنواری اور بیاہی عورتیں بدکاری پر فخر کرتی تھیں اور جس طرح مرد کسی نامی اور مشہور خاندان کی عورت سے بدکاری کرکے فخر کے طور پر بیان کرتا تھا اسی طرح عورتیں کسی نامور

اور مشہور خاندان کے مرد سے بدکاری کر کے فخریہ اُس کا اعلان کیا کرتی تھیں
شاعر اپنے اشعار اور قصیدوں میں دولتمند اور امیروں کی لڑکیوں بہنوں اور
بیویوں کے نام لے لے کر بیان کرتے اور ہر طرح کے عیبوں اور بُرائیوں کو اُن
سے منسوب کرتے۔ لونڈیوں کو اس لیئے گانا بجانا سکھایا جاتا تھا کہ وہ بدکاری
کے ذریعہ سے اپنے آقاؤں کے لیئے مال و دولت کمائیں۔

مرد بیوڑ کے ریوڑ بیویوں کے رکھتے تھے۔ جن میں بلا تکلف باپ کی منکوحہ
عورتیں بھی بطور میراث کے شامل ہوتی تھیں۔ طلاق کی رسم کا بہت ہی بُرے
طریقہ سے اُن میں رواج تھا۔ یعنی مرد طلاق کے بعد بھی عورت کا پیچھا نہ
چھوڑتے تھے۔ طلاق کے بعد عورت تو ایک میعاد معینہ تک نکاح ثانی کی مجاز نہ
تھی مگر مرد اُس کو پھر اپنی زوجیت میں لے لیتا تھا۔ اور پھر طلاق دے دیتا
تھا۔ اور اس بار بار کی طلاق اور رجعت سے کبھی تو یہ غرض ہوتی تھی کہ عورت
کسی دوسرے مرد سے ازدواج نہ کرے جو شوہر سابق کی ذلت کا باعث ہو
اور کبھی یہ کہ بچاری تنگ اور مجبور ہو کر اپنے حق مہر سے دست بردار ہو جائے۔
غرض عورتوں کو کسی قسم کی آزادی اور حقوق حاصل نہ تھے۔ اور وہ فی الواقع
نہایت ذلیل اور پست حالت میں تھیں۔

یتیم لڑکوں اور لڑکیوں کی حالت بھی نہایت قابل رحم تھی۔ اُن کے ولی
اُن کا مال کھا جاتے تھے۔ یا اچھے کی جگہ بُرا بدل دیتے تھے اور اُن کے بالغ

ہونے سے پہلے ہی بے جا طور پر خرچ کر ڈالتے یتیم لڑکیوں کا یہ حال تھا کہ اگر خوبصورت ہوتیں تو بلوغ سے پہلے ہی اُن کے ساتھ خود نکاح کر لیتے! اور اس حیلہ سے اُن کے مال پر بھی قابض اور متصرف ہو جاتے تھے۔ اور اگر بدصورت ہوتیں تو اُن کو شادی کرنے سے اس غرض سے روک دیتے تھے کہ وہ کنواری ہی چل بسیں اور اُن کا مال اُن کو وراثت میں مل جائے۔ حق ہمسائیگی کوئی چیز ہی نہ تھا جس کا پاس و لحاظ کرتے۔ بجز شراب خواری قمار بازی و بُت پرستی کے اور کچھ کام نہ تھا۔ گھر گھر بت پجتے تھے قبیلہ قبیلہ کا خدا جدا تھا قوم کی قوم جاہل تھی۔ اور دُنیا کی قوموں سے ایسے بے تعلق اور کونے میں پڑی ہوئی تھی کہ تعلیم و تربیت کی پرچھائیں تک اُس پر نہ پڑی تھی۔ اور ایک غیر معلوم زمانہ سے جہالت و ضلالت میں ایسی سرشار اور ڈوبی ہوئی تھی کہ مبدا و معاد کی کچھ خبر ہی نہ تھی یہ لوگ انسان کی ہستی کا مال صرف یہ سمجھے ہوئے تھے کہ جینا مرنا جو کچھ ہے اسی دُنیا میں ہے اس کے بعد کچھ نہیں جب وقت پورا ہو جاتا ہے مر جاتے ہیں مارنے جلانے والا کوئی نہیں۔

شمس العلما مولانا حالی مرحوم نے اہل عرب کے ان حالات کا صحیح نقشہ اپنے مشہور مسدس میں اس طرح کھینچا ہے۔

وہ دُنیا میں گھر سب سے پہلا خدا کا ‏ ‏ خلیل ایک معمار تھا جس بنا کا

ازل میں مشیت نے تھا جس کو تاکا ‏ ‏ کہ اس گھر سے اُبلے گا چشمہ ہدیٰ کا

وہ تیرتھ تھا اک بت پرستوں کا گویا
جہاں تین سو ساٹھ بت پج رہا تھا

قبیلہ قبیلہ کا اک بت جدا تھا کسی کا ہبل تھا کسی کا صفا تھا
یہ عزّیٰ پہ وہ نائلہ پر فدا تھا اسی طرح گھر گھر نیا اک خدا تھا

نہاں ابر ظلمت میں تھا مہرِ انور
اندھیرا تھا فاران کی چوٹیوں پر

چلن ان کے جتنے تھے سب وحشیانہ ہر اک لوٹ اور مار میں تھا یگانہ
فسادوں میں کٹتا تھا ان کا زمانہ نہ تھا کوئی قانون کا تازیانہ

وہ تھے قتل و غارت میں چالاک ایسے
درندے ہوں جنگل میں بیباک جیسے

نہ ٹلتے تھے ہرگز جو اڑ بیٹھتے تھے سلجھتے نہ تھے جب جھگڑ بیٹھتے تھے
جو دو شخص آپس میں لڑ بیٹھتے تھے تو صدہا قبیلے بگڑ بیٹھتے تھے

بلند ایک ہوتا تھا گر واں شرارا
تو اس سے بھڑک اٹھتا تھا ملک سارا

وہ بکر اور تغلب کی باہم لڑائی صدی جس میں آدھی انھوں نے گنوائی
قبیلوں کی کر دی تھی جس نے صفائی تھی اک آگ ہر سو عرب میں لگائی

نہ جھگڑا کوئی ملک و دولت کا تھا وہ

کرشمہ اک اُن کی جہالت کا تھا وہ

کہیں تھا مویشی چرانے پہ جھگڑا کہیں پہلے گھوڑا بڑھانے پہ جھگڑا
لب جو کہیں آنے جانے پہ جھگڑا کہیں پانی پینے پلانے پہ جھگڑا

یونہیں روز ہوتی تھی تکرار اُن میں
یونہیں چلتی رہتی تھی تلوار اُن میں

جو ہوتی تھی پیدا کسی گھر میں دختر تو خوفِ شماتت سے بے رحم مادر
پھرے دیکھتی جب تھی شوہر کے تیور کہیں زندہ گاڑ آتی تھی اُس کو جا کر

وہ گود ایسی نفرت سے کرتی تھی خالی
جنے سانپ جیسے کوئی جننے والی

جو اُن کی دن رات کی دل لگی تھی شراب اُن کی گھٹی میں گویا پڑی تھی
تعیش تھا غفلت تھی دیوانگی تھی غرض ہر طرح اُن کی حالت بری تھی

بہت اس طرح اُن کو گزری تھی صدیاں
کہ چھائی ہوئی نیکیوں پر تھیں بدیاں

اس انتہائی جہالت اور ضلالت کا اقتضا تھا کہ پردۂ غیب سے ایک ہاتھ ربانی قوت وقدرت کے ساتھ پیدا ہو جو ان بدحالیوں اور گمراہیوں پر جنھوں نے ایمان و اخلاق کی گردن پر چھری پھیر رکھی تھی جھاڑو پھیر دے۔ چنانچہ اپنے درماندہ بندوں کو جہل اور گمراہی کے تیرہ و تار بیابان میں آوارہ د

سرگرداں دیکھ کر رحمت حق جوش میں آئی اور خدا کے فرشتے نے اس پاک رسول کو جو رات کے سناٹے میں یکہ و تنہا کوہ حرا کی چوٹی پر اس بیچون و بیچگون ذات کے تصور میں محو تھے نہایت محبت آمیز خطاب کے ساتھ پکارا

"یَا اَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ۔ قُمْ فَاَنْذِرْ۔ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ۔ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ۔ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ۔ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ۔ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ۔ فَاِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُورِ۔ فَذٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَوْمٌ عَسِيرٌ۔ عَلَى الْكَافِرِينَ غَيْرُ يَسِيرٍ"

یعنی اے چادر میں لپٹ کر لیٹنے والے اٹھو۔ اور اپنی گمراہ قوم کو (عذاب خدا سے) ڈراؤ۔ اور اپنے پروردگار کی عظمت اور بزرگی ظاہر کرو اور پاکی اور پاکدامنی اختیار کرو۔ اور شرک و بت پرستی کی نجاست اور ناپاکی سے (جس میں تمہاری قوم لتھڑ رہی تھی) اپنے آپ کو بچاؤ اور (تبلیغ و رسالت کو) بڑا کارنمایاں سمجھ کر لوگوں پر احسان نہ رکھو۔ اور (تبلیغ و رسالت میں) جو مشکلات پیش آئیں (ان پر) اپنے پروردگار (کی رضاجوئی) کے لیے صبر کرو۔ اور پھر جبکہ صور پھونکا جائیگا تو وہ دن کافروں کے حق میں ایسا مشکل دن ہوگا کہ اس میں مطلق آسانی نہ ہوگی"۔

اس ندائے غیبی کے سُنتے ہی آپ پہاڑ سے اُتر کر اپنی قوم کے پاس آئے اور اُن کو جہالت اور ضلالت کی گہری نیند سے جگانا شروع کر دیا۔ اور اپنے منصب عالی کے عظیم ترین اور مشکل ترین کام کو ایسے کامل و اکمل طور پر انجام دیا جس کی کوئی نظیر اور مثال تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔ اور اُس نے اپنے پر تاثیر معجزانہ وعظ سے ایک قابلِ حیرت قلیل عرصہ میں ملک کے ملک کو خدا شناس اور خدا پرست بنا دیا۔

ہ فخرِ عرب زیبِ محراب و منبر — تمام اہلِ مکہ کو ہمراہ لے کر
گیا ایک دن حسب فرمانِ داور — سوئے دشت اور چڑھ کے کوہ صفا پر
یہ فرمایا سب سے کہ اے آلِ غالب
سمجھتے ہو تم مجھ کو صادق کہ کاذب
کہا سب نے قول آج تک کوئی تیرا — کبھی ہم نے جھوٹا سُنا اور نہ دیکھا
کہا گر سمجھتے ہو تم مجھکو ایسا — تو باور کرو گے اگر میں کہونگا
کہ فوجِ گراں پشتِ کوہِ صفا پر
پڑی ہے کہ لوٹے تمھیں گھات پا کر
کہا تیری ہر بات کا یاں یقیں ہے — کہ بچپن سے صادق ہے تو اور امیں ہے
کہا گر مری بات یہ دل نشیں ہے — تو سُن لو خلاف اس میں اصلا نہیں ہے
کہ سب قافلہ یہاں سے ہے جانے والا

ڈرو اُس سے جو وقت ہی آنے والا

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی
عرب کی زمیں جس نے ساری ہلادی
نئی اک لگن دل میں سب کے لگادی
اک آواز میں سوتی بستی جگا دی

پڑا ہر طرف غل یہ پیغامِ حق سے
کہ گونج اُٹھے دشت و جبل نامِ حق سے

غرض صرف ۲۳ برس کے محدود عرصہ میں وہی عرب جو باطل پرستی کا عادی بداخلاقی اور طرح طرح کی برائیوں کی گھٹا ٹوپ تاریکی میں صدیوں سے آوارہ و سرگرداں تھا خالص ایمان باللہ اور مکارم اخلاق کی چکا چوند روشنی سے منور ہو گیا۔ شرک و مخلوق پرستی کی نجاست سے دل پاک و صاف ہو گئے زہد و تقویٰ پاکی اور پاکدامنی ہر شخص کا شعار ہو گئی۔ خدا کے گھر سے بت نکالے گئے اور چاروں طرف خالص توحید کا ڈنکا بجنے لگا۔

خلاصہ یہ کہ قرآن مجید کی تعلیم نے وہ اثر دکھلایا کہ عرب کے بت پرست جاہل اور بداخلاق لوگ دنیا میں سب سے زیادہ عالم سب سے زیادہ خدا پرست سب سے زیادہ متمدن سب سے زیادہ تہذیب یافتہ اور سب سے زیادہ طاقتور بن گئے اور اس تعلیم نے بہت جلد اُن میں ایسا کامل ایمان۔ ایسے راسخ عقیدے۔ ایسے پاکیزہ اخلاق اور ایسی غیر معمولی اولوالعزمی پیدا کر دی کہ ایک طرف تو وہ خدائے واحد کے سچے پرستار بن گئے اور دوسری طرف

چند سال کے عرصہ میں دنیا کی بڑی بڑی سلطنتوں نے متفقہ طور سے اُن کے سامنے سر اطاعت خم کر دیا۔

جنگ قادسیہ کے موقعہ پر جو ۱۴ھ میں ہوئی تھی ایک ایرانی جرنیل نے کہا تھا کہ "ہم لوگ ان لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے یہ رات کو فرشتے ہوتے ہیں اور دن کو شیر"

غور کرنے کا مقام ہے کہ وہ کلام پاک جس کی معجزانہ اور حیرت انگیز ہدایات نے مردہ عرب کو اس طرح زندہ جاوید کر دیا اور وحشیوں کو مہذب، جاہلوں کو عالم۔ اور غافلوں کو عارف باللہ بنا دیا۔ اگر وحی و الہام نہ تھا تو وہ کیا تھا؟ اور کیا یہ ممکن تھا کہ بغیر تعلیم الٰہی اور ہدایت ربّانی کے کوئی انسان خصوصاً ایک ایسا شخص جو اُمی محض ہو ایسا معجزانہ کلام کر سکے۔

ریورینڈ مسٹر باسورتھ ایم۔ اے جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اپنی مشہور کتاب "محمدن اینڈ محمدنزم" میں مسلمانوں کی ہجرت حبش کے تذکرہ کے سلسلہ میں فرماتے ہیں "اس ہجرت کا ایک اچھا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمیں حضرت محمدؐ کی ابتدائی تعلیم کا ایک اعلیٰ درجہ کا خلاصہ ہاتھ آگیا جو اب تک ہمارے پاس موجود ہے۔ یعنی جب نجاشی شاہ حبش نے مسلمانوں کو اپنے دربار میں بلا کر اُن کے نئے مذہب کی بابت استفسار کیا تو حضرت جعفرؓ نے مسلمانوں کا نمائندہ بن کر نجاشی کے دربار میں ایک تقریر کی اور اُس میں مختصر طور پر اسلامی تعلیم کی نوعیت بادشاہ کو

سمجھائی ہی مسٹر باسورتھ اسمتھ نے اپنی کتاب میں حضرت جعفرؓ کی تقریر کا ترجمہ انگریزی میں درج کیا ہی اور تاریخ ابن ہشام میں حضرت جعفرؓ کے اصل الفاظ نقل کیئے گئے ہیں۔ ذیل میں ان دونوں کو پیش نظر رکھ کر اُس تقریر کا اُردو ترجمہ تحریر کیا جاتا ہی:-

ای بادشاہ ہم ایک جاہل اور گمراہ قوم تھے۔ بُت پوجتے تھے مُردار گوشت کھایا کرتے تھے۔ بدگوئیاں اور بدکاریاں کیا کرتے تھے ہم بنی نوع انسان کے جذبات اور حسیات کی مطلق پرواہ نہ کرتے تھے۔ مہماں نوازی کے فرائض سے غافل تھے۔ ہمسایوں کے ساتھ بدسلوکی کرتے تھے۔ زبردست کمزور کا مال کھا جاتا تھا۔ ایک مُدّت سے ہماری یہی حالت چلی آتی تھی یہاں تک کہ خدا نے ہمارے ہی میں سے ایک پیغمبر ہمارے پاس بھیجا۔ جس کی شرافت نسب۔ راستبازی۔ ایمانداری اور پاک دامنی سے ہم خوب واقف تھے اس نے ہم کو خدا کی وحدانیت کی طرف بُلایا تاکہ ہم صرف اُسی ایک خدا کو خدا جانیں اور اُسی کی عبادت کریں۔ اور ان بتوں اور پتھروں کی پرستش چھوڑ دیں جن کو ہمارے باپ دادا پوجتے تھے اور حکم دیا کہ ہم صرف خدا ہی کی عبادت کریں اور کسی چیز کو ذات۔ صفات۔ اور استحقاق عبادت میں اُس کے ساتھ شریک کریں

اور ہم کو پانچوں وقت نماز پڑھنے، اور سال بھر کے بعد بقیہ مال کا چالیسواں حصّہ صدقہ دینے۔ اور ماہ رمضان میں سوائے بیماری اور سفر کے روزہ رکھنے کا حکم دیا (پھر ایک ایک کرکے تمام احکام اسلام اُس کے سامنے بیان کیے اور کہا کہ) اُس پیغمبر نے ہم کو سچ بولنے اور امانت کو اُس کے مالک کے پاس پہونچا دینے عاجزوں پر رحم کرنے۔ اور قرابت داروں سے رعایت و مروّت کرنے اور ہمسایوں کے ساتھ نیکی سے پیش آنے اور بُرے اور حرام کاموں اور خون خرابوں سے بچنے کا حکم دیا۔ اور بدکاریوں اور جھوٹی گواہی دینے اور بن ماں باپ کے بچّوں کے مال کھا لینے اور پاکدامن عورتوں پر تہمت لگانے سے منع کیا پس ہم نے اُس کو سچا جانا اور جو حکام خدا کی طرف سے اُس نے پہونچائے اُن کی پیروی اختیار کی۔ لہذا ہم صرف ایک ہی خدا کی عبادت کرتے ہیں۔ اور کسی چیز کو کسی بات میں بھی اُس کے ساتھ شریک نہیں کرتے۔ اور جو چیز خدا نے ہم پر حرام کر دی ہے اُس کو حرام اور جو حلال کر دی ہے اُس کو حلال جانتے ہیں پس اس بات پر ہماری قوم ہماری دُشمن ہوگئی۔ اور طرح طرح سے ہم کو دُکھ دیا۔ اور ہم کو ہمارے دین سے پھرانا چاہا کہ خدا کو چھوڑ کر پھر پتھر اور لکڑی کے بُت پوجنے لگیں۔ اور جن بُری باتوں اور چیزوں کو ہم

چھوڑ چکے ہیں اور ناجائز سمجھتے ہیں اُن کو جائز سمجھیں"

اسلام سے پیشتر مکہ کے جزیرہ و تار حالت تھی اور پھر اسلام نے جو روحانی اور اخلاقی روشنی اُس میں پھیلائی یہ تقریر اُس کا مختصر مگر صحیح فوٹو ہے۔ قرآن مجید قوانین کا ایک مجموعہ ہے جس میں بنی آدم کی روحانی۔ اخلاقی اور معاشرتی ہدایت اور رہنمائی کے علاوہ تمدن۔ سیاست اور جہانبانی کے اصول و قواعد بھی منضبط کیئے گئے ہیں۔ دُنیا کے بڑے بڑے نامور مقنن جو بڑی بڑی سلطنتوں اور حکومتوں کے رُکن اعظم ہوتے ہیں۔ اہل ملک کے سود و بہبود کے لیئے مہینوں بلکہ برسوں کے غور و فکر اور بحث و مباحثہ کے بعد جو قانون مرتب کرتے ہیں اُن کے نافذ ہوتے ہی اُن کے نقایص نمایاں ہونے لگتے ہیں اور ترمیمات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے یہاں تک کہ چند سال کے بعد اُس قانون کی ہیئت بہت کچھ بدل جاتی ہے۔ مگر کلام الٰہی میں جو قانون اور قاعدے مقرر کر دیئے گئے ہیں ساڑھے تیرہ سو برس گزر جانے کے بعد بھی اُن میں کسی ترمیم کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ بلکہ حیرت بالائے حیرت یہ ہے کہ طلاق اور تعداد ازدواج وغیرہ جیسے اسلام کے معاشرتی قوانین جو کچھ عرصہ پیشتر مغرب کے شایستہ اور مہذب ممالک میں ہدف طعن و تشنیع بنے ہوئے تھے آج اُنھیں ممالک میں وہی اصول قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے

مارہے ہیں۔ اور بعض اُصولوں کے اتباع کی طرف میلان خاطر پایا جاتا ہے۔
غرض قرآن مجید نے جس طرح انسان کی باطنی یعنی روحانی اور اخلاقی حالت
کی اصلاح اور اُس کے ترقی دینے میں حصہ لیا ہے اسی طرح اُس کے ظاہری اور
سوشیل حالت کی ترقی اور اصلاح کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ اور اس کے مواعظ
و احکام سے جیسے کہ فرداً فرداً لوگوں کی باطنی اور ظاہری حالت کی اصلاح و
ترقی ہوئی ویسی ہی اُن کی مجموعی اور تمدنی حالت کو عظمت اور شوکت عزت
اور عروج حاصل ہوا۔ اگرچہ اس کا اصلی اور مقصود بالذات کام انسان کی
روحانی اور اخلاقی حالت کی اصلاح کرنا اور اس کو ترقی دے کر اس اعلےٰ
درجہ پر پہونچا دینا تھا جس کے لیئے وہ مخلوق ہوا ہے۔ یعنی تقریب ذات الہیٰ۔ اور
نجات آخرت۔ اور عالم غیر محسوس کی غیر محدود سعادت و مسرت کا حاصل کرنا
مگر یہ اُس کے کمال خوبی اور عمدگی کی دلیل ہے کہ اُس نے روحانی اور اخلاقی
نیکیوں کی تعلیم کے ساتھ تمدن اور حسن معاشرت کی نیکیوں کی بھی بدرجہ اتم
تعلیم کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کی روحانی ترقی اور عروج کے ساتھ اُن کی
ظاہری اور تمدنی حالت کی بھی اصلاح اور ترقی ہوتی گئی۔

اس رسالہ میں قرآن مجید کی تعلیم پر تفصیلی بحث کی گنجایش نہیں ہے۔ صرف
اُس کی ہدایت کے نتائج کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے۔ چنانچہ اس مقصد کو پیش نظر

رکھ کر چند غیر مذہب کے علما اور فضلا اور محققین کی رائیں ذیل میں درج کرنا مفید معلوم ہوتا ہے یہ رائیں اُن معروف تاریخی حالات اور واقعات پر مبنی ہیں جن کا ان میں ذکر ہے۔ اور جن سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ وَالْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْاَعْدَاءُ۔

(۱) آنریبل سر ولیم میور جو ایک بلند پایہ عیسائی محقق ہیں اور جب تک کہ علانیہ اور روشن وجہ نہ ہو اسلام کے حق میں گواہی نہیں دیسکتے۔ اپنی کتاب "لائف آف محمدؐ" میں لکھتے ہیں (صفحہ ۲۶۹-۲۷۱۔ مطبوعہ ۱۸۶۱ء)

> اگرچہ محمدؐ کے اوامر و احکام اس وقت تک تھوڑے سے اور سادہ طور کے تھے مگر اُنھوں نے ایک تعجب انگیز اور عظیم الشان کام کیا۔ جبکہ دین مسیحی نے دنیا کو خواب غفلت سے بیدار کیا تھا اور شرک و بت پرستی سے جہاد عظیم کیا تھا اُس وقت سے حیات روحانی کبھی ایسی برانگیختہ نہ ہوئی تھی اور نہ ایسا غلو کسی مذہب میں ہوا تھا جیسا کہ دین اسلام میں ہوا۔ اس دین کے خوش اعتقاد پیرووں نے کیسے کیسے نقصانات صرف اپنے ایمان کی خاطر اُٹھائے۔ ہجرت سے تیرہ برس پہلے تو مکہ ذلیل حالت میں بے جان پڑا تھا۔ مگر ان تیرہ برسوں نے کیا ہی اثر عظیم پیدا کیا۔ کہ سیکڑوں آدمیوں کی جماعت نے بُت پرستی چھوڑ کر خدائے واحد کی پرستش اختیار کی .... ہجرت کے بعد مدینہ

میں بھی اُسی جادو بھری تاثیر نے دو یا تین برس کے عرصہ میں اُن لوگوں کے واسطے ایک ایسی برادری تیار کر دی جو نبی اور مسلمانوں کی حمایت میں جان دینے کو مستعد ہو گئی"۔

سر ولیم میور اپنی اُسی کتاب میں دوسری جگہ لکھتے ہیں:-

"ہم بے تامل اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اُس نے (یعنی مذہب اسلام نے) ہمیشہ کے واسطے اکثر توہمات باطلہ کو جن کی تاریکی مدتوں سے عرب کے ملک پر چھا رہی تھی کالعدم کر دیا۔ اسلام کی صدائے جنگ[1] کے رو برو بُت پرستی موقوف ہو گئی۔ اور خدا کی وحدانیت اور غیر محدود کمالات اور ایک ہر جگہ احاطہ کرنے والی قدرت کا مسئلہ حضرت محمدؐ کے معتقدوں کے دلوں میں اور جانوں میں ایسا ہی زندہ اصول ہو گیا ہے جیسا کہ خاص حضرت محمدؐ کے دل میں تھا۔ مذہب اسلام میں سب سے پہلی بات جو خاص اسلام کے معنے ہیں یہ ہے کہ خدا کی مرضی پر توکل مطلق کرنا چاہیئے۔ بلحاظ معاشرت کے بھی اسلام میں

---

[1] صدائے جنگ نے بت پرستی کو معدوم نہیں کیا بلکہ قرآن مجید کے نہایت فصیح اور پر تاثیر فقروں سے لوگوں کے دلوں پر جو اثر ہوتا تھا اُس نے نہ صرف عرب سے بت پرستی کو نیست و نابود کر دیا بلکہ تمام مذہبوں میں جو اُس وقت دنیا میں رائج تھے اور جہاں تک اسلام کے واعظوں کی آواز پہونچتی تھی یہ خیال پیدا کر دیا کہ بُت پرستی نہایت کمینہ خصلت اور ایک سخت گناہ ہے۔ ۱۲

کچھ کم خوبیاں نہیں ہیں چنانچہ مذہب اسلام میں یہ ہدایت ہے کہ سب مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ برادرانہ محبت رکھیں یتیموں کے ساتھ نیک سلوک کرنا چاہیئے۔ غلاموں کے ساتھ انتہائی شفقت برتنی چاہیئے۔ نشہ کی چیزوں کی ممانعت ہے۔ مذہب اسلام اس بات پر فخر کر سکتا ہے کہ اس میں پرہیزگاری کا ایک ایسا درجہ موجود ہے جو کسی اور مذہب میں نہیں پایا جاتا"

(نوٹ مولف۔ سرسید احمد خاں صاحب مرحوم نے اس عبارت کے سلسلہ میں اپنی کتاب کے حاشیہ پر لکھا ہے کہ "اس میں اتنا اضافہ اور کرنا چاہیئے تھا کہ مذہب اسلام نے قمار بازی کو منع کرنے اور ناشائستہ کلمات منہ سے نکالنے کی ممانعت سے اور والدین کے ساتھ محبت اور تعظیم سے پیش آنے کی تاکید سے اور ایک مناسب اندازے سے خیرات دینے کی ترغیب سے۔ لوگوں کو ان کی حاجت کے وقت قرض حسنہ دینے اور وعدہ وفا کرنے کی تاکید سے جانوروں کے ساتھ رحم اور مہربانی کا برتاؤ کرنے کے حکم سے انسانوں کے اخلاق اور ان کے حسن معاشرت میں بہت کچھ ترقی دی ہے")

۲۔ زوال سلطنت رومۃ الکبریٰ کا مشہور فاضل مورخ ایڈورڈ گبن لکھتا ہی کہ:۔ (جلد پنجم پچاسواں باب صفحہ ۴۶۹۔ ۴۷۰)

محمدؐ کا مذہب شکوک اور شبہات سے پاک و صاف ہی۔ قرآن خدا کی وحدانیت پر ایک عمدہ شہادت ہو۔ مکہ کے پیغمبر نے بتوں کی انسانوں کی۔ ثوابت اور سیاروں کی پرستش کو اس معقول دلیل سے رد کیا کہ جو شئے طلوع ہوتی ہی غروب ہو جاتی ہی۔ اور جو حادث ہی وہ فانی ہوتی ہی۔ اور جو شئے قابل زوال ہی وہ معدوم ہو جاتی ہی اس نے اپنی معقول سرگرمی سے کائنات کے بانی کو ایک ایسا وجود تسلیم کیا جس کی نہ ابتدا ہی نہ انتہا۔ نہ وہ کسی شکل میں محدود نہ کسی مکان میں۔ نہ اس کا کوئی ثانی وجود ہی جس سے اس کو تشبیہ دے سکیں۔ وہ ہمارے نہایت خفیہ رازوں پر بھی آگاہ رہتا ہی۔ بغیر کسی اسباب کے موجود ہی۔ اخلاق اور عقل کا کمال جو اس کو حاصل ہی وہ اس کو اپنی ذات سے حاصل ہی۔ ان بڑی بڑی حقائق کو پیغمبر نے مشہور کیا۔ اور اس کے پیرووں نے اس کو نہایت مستحکم طور سے قبول کیا۔ اور قرآن کے مفسروں نے معقولات کے ذریعہ سے ان کی تشریح و تصریح کی ہی۔ ایک حکیم جو خدا تعالیٰ کے وجود اور اس کی صفات پر اعتقاد رکھتا ہو مسلمانوں کے

مذکورہ بالا عقیدہ کی نسبت یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ ایسا عقیدہ ہی جو ہمارے موجودہ ادراک اور قوائے عقلی سے بڑھ کر ہی اس لیئے کہ جب ہم نے اُس نامعلوم چیز (خدا) کو زمان و مکان اور حرکت اور مادہ۔ اور حس و تفکر کے اوصاف سے مبرا کردیا تو پھر ہمارے خیال کرنے اور سمجھنے کے لیئے کیا چیز باقی رہ گئی وہ اصل (یعنی توحید ذات و صفات باری تعالےٰ) جس کی بنا عقل اور وحی پر کی محمدؐ کی شہادت سے استحکام کو پہونچی۔ چنانچہ اُس کے معتقد ہندستان سے لیکر مراکو تک موحد کے لقب سے ممتاز ہیں۔ اور تصویروں کے ممنوع کردینے سے بُت پرستی کا خطرہ مٹا دیا گیا"

یہی فاضل مورخ دوسری جگہ جہاں یہ بحث کرتا ہی کہ حضرت محمدؐ اپنے ملک کے حق میں کیسے تھے لکھتا ہی کہ

حضرت محمدؐ کی سیرت میں سب سے آخری بات جو غور کرنے کے لائق ہی وہ یہ ہی کہ اُن کا عروج لوگوں کی بھلائی اور بہبود کے لحاظ سے مفید ہوا یا مضر۔ جو لوگ آنحضرتؐ کے سخت دشمن ہیں وہ بھی اور نہایت متعصب یہودی اور عیسائی بھی اُن کو پیغمبر برحق نہ ماننے کے باوجود اس بات کو ضرور تسلیم کریں گے کہ آنحضرتؐ نے دعویٰ رسالت ایک نہایت مفید مسئلہ کی تلقین کے لیئے اختیار کیا۔ گو وہ یہ کہیں کہ صرف ایک

ہمارے ہی مذہب کا مسئلہ اُس سے اچھا ہے (گویا وہ اس بات کو
تسلیم کرتے ہیں کہ سوائے ہمارے مذہب کے اور تمام دنیا کے مذہبوں
سے مذہب اسلام اچھا ہے) آنحضرت یہودیوں اور عیسائیوں کی کتب
سماویہ قدیمہ کی سچائی اور پاکیزگی اور اُن کے بانیوں یعنی اگلے پیغمبروں
کی نیکیوں اور معجزوں اور ایمانداری کو مذہب اسلام کی بنیاد
خیال کرتے تھے۔ عرب کے بُت خدا کے تخت کے روبرو توڑ دیئے
گئے۔ اور انسانوں کے خون کے کفارہ کو نماز روزہ اور خیرات سے
بدل دیا۔ جو ایک پسندیدہ اور سیدھے سادے طریقہ کی عبادت ہے
یعنی انسان کی جو قربانی بتوں پر ہوتی تھی اُس کو معدوم کیا اور
اُس کے عوض نماز روزہ اور خیرات کو کفارہ قرار دیا۔ ان کے
عقبیٰ کی جزا و سزا ایسی تمثیلوں میں بیان کی جو ایک جاہل اور ہوا
پرست قوم کی طبیعت کے لئے نہایت موزوں تھیں۔۔۔۔۔۔۔
آنحضرت نے مسلمانوں میں نیکی اور محبت کی ایک روح ڈالدی
آپس میں بھلائی کرنے کی ہدایت کی اور اپنے احکام اور نصیحتوں
سے انتقام کی خواہش اور بیوہ عورتوں اور یتیموں پر ظلم و ستم ہونے
کو روک دیا۔ قومیں جو کہ باہم مخالف تھیں اعتقاد اور فرمانبرداری
میں متفق ہوگئیں۔ جو بہادری خانگی جھگڑوں میں بے ہودہ طور سے

صرف ہوتی تھی نہایت مستعدی سے ایک غیر ملک کے دشمن کے
مقابلہ پر مائل ہوگئی"

یہی مورّخ اسلام کے متعلق دوسری جگہ لکھتا ہے:-

"اسلام نے کسی مذہب کے مسائل میں دست اندازی نہیں کی کسی کو
ایذا نہیں پہونچائی۔ کوئی مذہبی عدالت خلاف مذہب والوں کو
سزا دینے کے لیئے قایم نہیں کی۔ اور اسلام نے کبھی لوگوں کے
مذہب کو بہ جبر تبدیل کرنے کا قصد نہیں کیا۔ ہاں اس نے اپنے مسائل
کا جاری ہونا چاہا مگر اُن کو جبراً جاری نہیں کیا۔ اسلام قبول کرنے
سے لوگوں کو فتحمندوں کے برابر حقوق حاصل ہو جاتے تھے اور مفتوحہ
سلطنتیں اُن شرائط و قیود سے بھی آزاد ہو جاتی تھیں جو ہر ایک
فتحمند ابتدائے دُنیا سے حضرت محمدؐ کے زمانہ تک ہمیشہ عاید کیا کرتا تھا"

مسٹر ایڈورڈ گبن ایک اور جگہ لکھتے ہیں:-

"اسلام کی تاریخ میں ایک ایسی خصوصیت پائی جاتی ہے جو دوسرے
مذہب کو غیر آزاد رکھنے کے بالکل برخلاف ہے۔ اسلام کی تاریخ کے
ہر ایک صفحہ میں اور ہر ایک ملک میں جہاں اُس کو وسعت ہوئی

دوسرے مذہب سے مزاحمت نہ کرنا پایا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ فلسطین میں ایک عیسائی شاعر "لامارٹین" نے ان واقعات سے جن کا ہم ذکر کر رہے ہیں بارہ سو برس کے بعد علانیہ یہ کہا تھا کہ صرف مسلمان ہی تمام روئے زمین پر ایک ایسی قوم ہیں جو دوسرے مذہب کو آزادی سے رکھتی ہیں۔"

مسٹر جان ڈیون پورٹ جن کا ذکر آنحضرت صلعم کے حالات کے سلسلہ میں ہو چکا ہے۔ اپنی کتاب "اپالوجی فار محمد اینڈ دی قرآن" میں لکھتے ہیں کہ

"ایسا خیال کرنا جیسا کہ بعضوں نے کہا ہے بہت بڑی غلطی ہے کہ قرآن میں جس عقیدہ کی تلقین کی گئی ہے اس کی اشاعت بزور شمشیر ہوئی تھی۔ کیونکہ جن لوگوں کی طبیعتیں تعصب سے مبرا ہیں وہ سب اس بات کو تسلیم کریں گے کہ حضرت محمدؐ کا دین (جس کے ذریعہ سے انسانوں کے خون یعنی قربانی کے بدلے نماز روزہ اور خیرات جاری ہوئی۔ اور جس نے عداوت اور دائمی جھگڑوں کی جگہ فیاضی اور حسن معاشرت کی ایک روح لوگوں میں پھونک دی اور جس کا اسی وجہ سے بہت بڑا اثر شائستگی پر ہوا ہوگا) مشرقی دنیا کے لیے ایک حقیقی برکت تھا اور اسی وجہ سے خاص کر اس کو اتنی خونریزی تدابیر کی حاجت نہ پڑی

ہو گی جن کا استعمال بلا استثنا اور بلا امتیاز حضرت موسیٰ نے بت پرستی کے نیست و نابود کرنے کو کیا تھا۔ پس ایسے اعلیٰ وسیلہ کے ساتھ جس کو قدرت نے بنی نوع انسان کے خیالات اور مسائل پر مدت دراز تک اثر ڈالنے کو پیدا کیا ہے گستاخانہ پیش آنا اور جاہلانہ مذمت کرنا کیسی لغو اور بے ہودہ بات ہے۔ جب ان معاملات پر خواہ اس مذہب کے بانی کے لحاظ سے خواہ اس مذہب کے عجیب و غریب عروج اور ترقی کے لحاظ سے نظر کی جاوے تو بجز اس کے اور کچھ چارہ نہیں کہ اس پر نہایت دل سے توجہ کی جائے۔ اس امر میں کچھ بھی شبہ نہیں ہو سکتا کہ جن لوگوں نے مذہب اسلام اور مذہب عیسوی کی خوبیوں کو بمقابلہ ایک دوسرے کے تحقیق کیا ہے اور ان پر غور کیا ہے ان میں سے بہت ہی کم ایسے بھی ہیں جو اس تحقیقات میں اکثر اوقات تردّد اور اس بات کے تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ مذہب اسلام کے احکام بہت ہی عمدہ اور مفید مقاصد ہیں بلکہ اس بات کا اعتقاد کرنے پر بھی مجبور ہوئے ہیں کہ آخر کار انسان کو مذہب اسلام سے فائدہ کثیر ہو گا!

مسٹر جان ڈیون پورٹ نے اپنی اسی کتاب میں یہ بھی لکھا ہے

"ہر ایک طرح کی شہادت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جن شخصوں نے

فلسفہ اور علوم و فنون کو سب سے پہلے زندہ کیا جو قدیمی اور زمانہ حال کے علم ادب کے درمیان بطور ایک سلسلے کے بیان کیئے گئے ہیں۔ بلاشبہ وہ ایشیا کے مسلمان اور اندلس کے مُور تھے جو خلفائے عباسیہ اور بنی امیہ کے عہد میں وہاں رہتے تھے۔ علم جو ابتداءً ایشیا سے یورپ میں آیا تھا اُس کا وہاں دوبارہ رواج مذہب اسلام کی دانشمندی سے ہوا۔ یہ بات معروف و مشہور ہی کہ اہل عرب میں چھ سو برس کے قریب سے علوم و فنون جاری تھے۔ اور یورپ میں جہالت و وحشیانہ پن پھیلا ہوا تھا اور علم ادب تقریباً نیست و نابود ہو گیا تھا۔ علاوہ اس کے یہ بات بھی تسلیم کرنی چاہیئے کہ تمام علوم طبیعات۔ ہیئت۔ فلسفہ۔ ریاضی جو دسویں صدی میں یورپ میں جاری تھے۔ ابتداءً عرب کے علما سے حاصل ہوئے تھے اور خصوصاً اندلس کے مسلمان فلسفہ کے موجد خیال کیئے جاتے ہیں؛

مسٹر جان ڈیون پورٹ یہ بھی لکھتے ہیں کہ

یورپ مذہب اسلام کا اور بھی زیادہ ممنون ہی کیونکہ اگر اُن جھگڑوں سے جو سلطان صلاح الدین کے وقت میں بیت المقدس کی لڑائیوں میں ہوئے جن کو فریقین جہاد کہتے تھے قطع نظر کی جاوے تو بتخصیص

مسلمانوں کے سبب سے فیوڈل انتظام[1] کی سختیاں اور امیروں کی خودمختاری یورپ سے موقوف ہوگئی جن کے اثرات پر ہمارے ملک یورپ کی آزادیوں کی نہایت بڑی اورعالی شان عمارت کی بنیاد قایم ہوئی۔ اہل یورپ کو یہ بات بھی یاد دلانا چاہیئے کہ وہ حضرت محمدؐ کے پیرووں کے (جو قدیم اور زمانہ حال کے علم ادب کے درمیان بطور سلسلہ کے ذریعہ ہیں) اس لحاظ سے بھی ممنون ہیں کہ مغربی تاریکی کی مدت دراز میں یونانی حکما کی بہت سی کتابیں فنون اور علوم ریاضی اور طب وغیرہ کے نہایت بڑے بڑے شعبوں کی انھیں کی کوششوں سے اشاعت پذیر ہوئیں۔"

یہی فاضل محقق آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

کہ "منجملہ بہت سی اعلیٰ درجہ کی خوبیوں کے جو قرآن کے لیئے واجب طور پر باعث فخر و ناز ہوسکتی ہیں دو خوبیاں نہایت بین ہیں یعنی اول تو اس کا وہ موقرانہ اور ہیبت و رعب سے بھرا ہوا

---

[1] فیوڈل انتظام سے وہ انتظام متصور ہے جس کی رو سے امرا اور وزرا کو اس شرط پر زمینیں درجاگیریں ملتی تھیں کہ وہ جنگ کے وقت حکومت کے لیئے لڑنے والے سپاہی مہیا کیا کریں۔ اس انتظام سے امرا کی طرف سے ظلم بہت ہوتے تھے۔ کیونکہ اُس وقت تک شخصی آزادی کا اصول جس کی اسلام نے تعلیم دی تھی یورپ میں رایج نہ تھا ۱۲ مولف

طرزِ بیان جو ہر اُس مقام پر جہاں خدا تعالیٰ کا ذکر آیا اس کی
قدرت کی طرف اشارہ ہے اختیار کیا گیا ہے اور جس میں خداوند عالم
کی ذات سے اُن جذبات اور اخلاقی نقائص کو منسوب نہیں کیا گیا جو
انسان میں پائے جاتے ہیں ... دوسرے اُس کا اُن تمام
خیالات والفاظ اور قصّوں سے مبرّا ہونا جو فحش اور خلافِ اخلاق
اور غیر مہذب ہوں۔ حالانکہ نہایت افسوس کی بات ہے کہ یہ عیوب
توریت وغیرہ کتب مقدسہ یہود میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ فی الحقیقت
قرآن ان سخت عیوب سے ایسا مبرّا ہے کہ اس میں حذف یا تخفیف
ترمیم کی کبھی ضرورت نہیں۔ اول سے آخر تک اُسے پڑھ جائیے تو
اُس میں کوئی بھی ایسا لفظ نہ پاؤ گے جو پڑھنے والے کے چہرہ پر
شرم و حیا کے آثار پیدا کرے۔ قرآن میں ذاتِ باری کی تعریف
نہایت منزّہ اور صاف ہے اور جو مذہب اس نے ان خوبیوں
کے ساتھ قائم کیا ہے وہ وحدانیت الٰہی کا نہایت پختہ اور شدید
یقین ہے۔ اور بجائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ کو فلسفیانہ طور پر صرف
ایسا مسبب الاسباب مان لیا جائے جو اس عالم کو اپنے مقررہ
قوانین پر چلا کر خود اپنی شان و عظمت کے اتنے الگ سا ہے کہ اس تک
کوئی شے نہیں پہنچ سکتی۔ قرآن کی رو سے وہ ہر وقت حاضر و ناظر ہے

اور اُس کی قدرت کاملہ ہمیشہ اس عالم میں عامل اور متصرف ہی
علاوہ ازیں اسلام ایسا مذہب ہی جس کے اصول میں کوئی امر
متنازعہ فیہ نہیں اور چونکہ اُس میں کوئی ایسا معمہ نہیں جو سمجھ میں نہ
آئے اور زبردستی قبول کرنا پڑے اس لیئے وہ لوگوں کے خیالات
کو ایک سیدھی سادی اور ایسی پرستش پر قایم رکھتا ہی جو تغیر پذیر
نہیں ہی۔ حالانکہ تیز رفتار اور اندھا دھند جوش مذہبی نے پیروان
اسلام کو اکثر اوقات آپے سے باہر کر دیا ہی"
"سب سے آخر یہ بات ہی کہ اسلام ایسا مذہب ہی کہ جس سے ولیوں
شہیدوں۔ اور تبرکات اور تصویروں کی پرستش اور ناقابل فہم باتیں
اور حکیمانہ باریکیاں اور راہبوں کی تجرد اور تعذیب نفس بالکل خارج
کردی گئی ہیں۔ چنانچہ اسلام میں ایسے ثبوت موجود ہیں جن پر
خیال کرنے سے معلوم ہوتا ہی کہ اُس کے بانی نے ماہیت اشیا
اور اُس زمانہ کی قوموں کی حالت اور نیز اس امر پر کہ مسائل
مذہبی عقل سے کیونکر مطابق ہوسکتے ہیں۔ ایک طویل اور عمیق
غور کے بعد اپنے مذہب کی بنا ڈالی ہی۔ اور اس وجہ سے یہ کچھ
محل تعجب نہیں ہی کہ اسلامی طور کی پرستش اہل کعبہ کی بت پرستی
اور صابئین کی پرستش اجرام فلکی اور زرتشتیوں کی آتش پرستی

پر غالب آگئی"!

۴۔ مسٹر گاڈفرے ہگنس اپنی کتاب "اپالوجی فار محمدؐ" کے فقرہ ۷۰ میں لکھتے ہیں کہ

حضرت مسیح کی انجیل کی طرح قرآن مجید غریب آدمیوں کا دوست اور غمخوار ہے۔ بڑے اور دولتمند آدمیوں کی بے انصافی کی ہر جگہ مذمت کی گئی ہے۔ وہ آدمیوں کی باعتبار شخصیت اور مدارج کے توقیر نہیں کرتا (نوٹ) بلکہ اسلام کی تعلیم کے مطابق سب سے زیادہ موقر وہ انسان ہے۔ جو سب سے زیادہ پرہیزگار اور خدا سے ڈرنے والا ہو۔ مولف) قرآن میں ایک بھی ایسا کوئی حکم نہیں بتلایا جاسکتا جس میں پولیٹکل خوشامد اور رواداری کی طرف ذرا سا بھی میل ہو"۔

ویسٹ منسٹر ریویو نے نہایت منصفانہ رائے دی ہے کہ "اگر کسی خود مختار مشرقی فرماں روا کو کوئی چیز کبھی روک سکتی ہے تو وہ غالبًا ایک جرأت رکھنے والے مظلوم کی زبانی قرآن مجید کی ایک بے تکلف آیت ہوسکتی ہے"۔

....آگے چل کر فقرہ ۱۰۵ اور ۱۰۷ میں مسٹر گاڈفرے ہگنس فرماتے ہیں کہ

یہ خیال کرنا ایک بہت بڑی غلطی ہے کہ دین محمدی صرف بزور شمشیر پھیلا ہے۔ جن لوگوں کا ایسا خیال ہے وہ سخت دھوکے میں مبتلا ہیں کیونکہ دین اسلام اُن قوموں نے بھی اختیار کیا ہے جن کو مسلمانوں کے ہتھیاروں کی قوت سے کبھی واسطہ نہیں پڑا . . . مسلمانوں پر ترکوں کا پہلا حملہ آٹھویں صدی کے آخر میں ہوا تھا۔ یہ لوگ ملک شمال سے جو مابین بحر کاسپین اور بحر اسود کے واقع ہے آئے۔ اُس وقت تک ترکوں نے دین محمدی اختیار نہیں کیا تھا مگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اُنھوں نے ان مغلوب مسلمانوں کا مذہب قبول کر لیا۔ ان فاتحین کے اس تبدیل مذہب سے وہ الزام جو بار بار دوہرایا جاتا ہے کہ دین اسلام کی کامیابی بزور شمشیر ہوئی ہے نہایت عجیب و غریب طور پر باطل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ یہاں سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ دین اسلام میں صرف وہی لوگ داخل نہیں ہوئے جو اُس نے زیر کیے بلکہ وہ لوگ بھی داخل ہوئے جنھوں نے مسلمانوں کو مغلوب اور مطیع کیا۔"

۵۔ ریورینڈ جی۔ ایم۔ راڈویل صاحب جنھوں نے قرآن مجید کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے اپنے ترجمہ کے دیباچہ میں قرآن مجید کی تعلیمات کی تاثیر کی

بعثت جس نے تمام اقوام عرب کو اس قدر جلد متاثر کیا فرماتے ہیں۔

"عرب کے خانہ بدوش سیدھے سادے بدو ایسے بدل گئے جیسے کسی نے سحر کر دیا ہو۔..... بت پرستی کے مٹانے پر جنات اور مادیات کے شرک کے عوض خدا کی عبادت قایم کرنے اطفال کشی کی رسم کو نیست و نابود کرنے اور بہت سے توہمات کو دور کرنے اور تعداد ازدواج کو گھٹا کر اس کی ایک حد معین کرنے میں قرآن بے شک عربوں کے لیے برکت اور قدوم عن تھا۔"

۲۔ چیمبرز انسائیکلوپیڈیا کا مقالہ نگار مذہب اسلام کے متعلق لکھتا ہے:

"مذہب اسلام کا وہ حصہ جس میں بہت کم تغیر و تبدل ہوا ہے اور جس سے اس کے بانی کی طبیعت صاف صاف معلوم ہوتی ہے اس مذہب کا نہایت کامل اور روشن حصہ ہے۔ اس سے ہماری مراد قرآن کے علم اخلاق سے ہے۔ ناانصافی۔ کذب۔ غرور۔ انتقام۔ غیبت۔ استہزا۔ طمع۔ فضول خرچی۔ عیاشی۔ خیانت اور بدگمانی نہایت قابل ملامت قرار دی گئی ہیں۔ اور ان کو قبیح اور بدی بتایا ہے۔ بمقابلہ ان کے خیر اندیشی۔ فیض رسانی۔ پاکدامنی۔ حیا۔ تحمل۔ صبر۔ کفایت شعاری۔ سچائی۔ راست بازی۔ عالی ہمتی۔ صلح پسندی

اور سچی محبت اور سب سے بڑھ کر "توکل بخدا" اور انقیاد امر الٰہی کو حقیقی ایمانداری کی اصل بنیاد اور مومن صادق کا اصلی نشان قرار دیا ہے۔

۷۔ایک عیسائی مضمون نگار کا بیان سر سید احمد خاں صاحب مرحوم نے اپنی کتاب خطبات احمدیہ کے چوتھے خطبہ میں یہ مضمون نقل کیا ہے۔

ایک جواب مضمون لکھنے والے نے جس نے یہ مضمون اختیار کیا تھا کہ "اسلام ایک ملکی انتظام ہے۔ جو شرق و غرب میں جاری ہے"۔ اسلام کی نسبت یہ لکھا ہے کہ "اسلام نے بچہ کشی کی رسم کا انسداد کر دیا جو اُس زمانہ میں عرب و جوار کے ملکوں میں جاری تھی۔ گو عیسائی مذہب نے بھی اُس کو روکا تھا مگر اسلام کی برابر اُس کو کامیابی نہیں ہوئی اسلام نے غلامی کو موقوف کر دیا جو اُس ملک کی پُرانی جاہلیت کی رسم تھی اسلام نے ملکی حقوق کو برابر کر دیا اور صرف انھیں لوگوں کے حق میں انصاف نہیں کیا جو اس مذہب کے معتقد تھے۔ بلکہ اُن شخصوں کے ساتھ بھی یکساں انصاف کیا جن کو اُس کے ہتھیاروں نے فتح کیا تھا۔ اسلام نے اُس محصول کو جو سلطنت کو دیا جاتا تھا گھٹا کر صرف دسواں حصہ کر دیا۔ اسلام نے تجارت کو تمام محصولات اور

مزاحمتوں سے آزاد کردیا۔ اسلام نے مذہب کے معتقدوں کو
اس سے بری کر دیا کہ اپنے مذہبی سرگروہ کو یا مذہبی کام کیلیئے
جبریہ چندہ دیں۔ اور تمام لوگوں کو اس سے بری کر دیا کہ غالب
مذہب کو ہر قسم کا مذہبی چندہ دیں۔ اسلام نے فرقۂ فتحمند کے تمام
حقوق مفتوحہ لوگوں میں سے اُن شخصوں کو بھی دیئے جو اپنے مذہب
کے پابند رہے۔ اُن کو ہر قسم کی پناہ دی۔ اسلام نے مال کی حفاظت
کی سود لینے کو اور خون کا بدلا بغیر حکم عدالت کے لینے کو موقوف
کیا۔ صفائی اور پرہیزگاری کا تحفظ کیا حرام کاری موقوف کی غریبوں
کو خیرات دینے اور ہر شخص کی تعظیم کرنے کی ہدایت کی"۔

۸۔ ریورینڈ کینن آئزک ٹیلر کا بیان

مسٹر آئزک ٹیلر صاحب نے جو انگلستان کے مشہور و معروف عالم اور محقق
تھے اور جو ۱۸۸۰ء میں "کینن" کے رتبہ پر فائز ہوئے تھے جو بشپ کی طرح ایک
اعلیٰ مذہبی عہدہ ہے قصبہ وُولورہیمپٹن کی چرچ کانگریس کے روبرو "افریقہ میں
اسلام کی ترقی" کی بابت ایک مضمون پڑھا تھا جو اخبار لندن ٹائمز اور سینٹ
جیمیس گزٹ لندن مورخہ ۸ اکتوبر ۱۸۸۰ء میں شایع ہوا تھا اُس کا ایک حصہ
ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

ہم کو یہ اقرار کرنا چاہیئے کہ اسلام دنیا کے ایک بڑے حصہ میں بطور ایک تبلیغی مذہب کے بہ نسبت عیسوی مذہب کے زیادہ ترکامیاب ہے۔ نہ صرف بت پرستی سے اسلام پر ایمان لانے والے بہ نسبت عیسائی مذہب پر ایمان لانے والوں کے زیادہ تر ہیں۔ بلکہ مذہب عیسائی بعض ملکوں میں درحقیقت اسلام کے سامنے سے ہٹتا جاتا ہے۔ اور مسلمان قوموں کو معتقد بنانے کی کوششیں بظاہر بالکل ناکام رہتی ہیں۔ اور صرف یہی نہیں کہ ہم وہاں اپنا قدم نہیں جما سکتے بلکہ ہم اپنی حفاظت کرنے میں بھی ناکام رہتے ہیں مذہب اسلام اس وقت مراکو سے جاوا تک اور زنگبار سے چین تک پھیلا ہوا ہے اور افریقہ میں بے حد تیزی سے پھیلتا جاتا ہے۔ انھوں نے کانگو اور زمبیسی میں قدم جمائے ہیں اور سیاہ فام اقوام کی سب سے بڑی ریاست اگنڈا کے باشندوں نے اسلام ابھی حال میں قبول کیا ہے۔ ہندوستان میں یورپین تہذیب جو ہندو مذہب کی جڑوں کو کھوکھلی کر رہی ہے حقیقت میں اسلام کے لیئے راستہ صاف کر رہی ہے۔ ساڑھے پچیس کروڑ میں سے پانچ کروڑ آدمی ہندوستان میں اس وقت مسلمان ہیں (نوٹ۔ اب ہندوستانی مسلمانوں کی تعداد سات کروڑ تک

پہونچ گئی ہو۔ مولف) اور افریقہ میں آدھے سے زیادہ۔
مذہب عیسوی اپنی گرفت میں خوب مضبوط نہیں ہے۔ اور ہندوستان
اور افریقہ میں اسلام کے سامنے سے ہٹتا جاتا ہے جیسے کالے حبشی
جو صرف نام کے عیسائی ہیں۔ اوبی ازم (بھوت پریت اور خیالی
چیزوں کی پرستش) قبول کرتے جاتے ہیں۔ اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ
افریقہ کی کوئی قوم جو ایک دفعہ اسلام قبول کرلیتی ہے پھر کبھی بت پرستی
اختیار نہیں کرتی اور نہ عیسائی مذہب کو قبول کرتی ہے۔
اسلام نے تہذیب کی اشاعت میں عیسویت سے زیادہ حصہ
لیا ہے۔ جب حبشیوں کی کوئی قوم اسلام قبول کرلیتی ہے تو بھوت
پریت کی پرستش۔ توہمات باطلہ۔ مردم خواری۔ انسانی قربانی۔
بچہ کشی وغیرہ اُن میں سے یکلخت مفقود ہو جاتی ہے۔ وہ لباس
پہننے لگتے ہیں۔ اُن سے گندگی دور ہو جاتی ہے۔ اور وہ پاک
وصاف رہنے لگتے ہیں۔ اُن میں حمیت اور خود داری کا احساس
پیدا ہو جاتا ہے۔ مہماں نوازی اُن کا شعار بن جاتا ہے شراب نوشی
کا رواج بہت ہی کم رہ جاتا ہے۔ بے حیائی کا ناچ اور مرد و
عورت کا قابل اعتراض خلا ملا رہنے کا رواج معدوم ہو جاتا ہے۔
عورتوں کی عصمت کی قدر ہونے لگتی ہے۔ کاہلی کی بجائے لوگ محنتی

بن جاتے ہیں امن پسندی اور پرہیزگاری کا اُن میں ولع ہو جاتا ہے خوں ریزی اور جانوروں اور غلاموں پر سختی اور بے رحمی ممنوع ہو جاتی ہے غلامی اور تعدد ازدواج کی برائیاں نہایت محدود ہو جاتی ہیں۔ وہ انسانی ہمدردی فیاضی اور اخوت کا سبق سیکھ لیتے ہیں...... اسلام جن نیکیوں کی تعلیم دیتا ہے ادنےٰ اقوام اُن کو خوب سمجھ لیتی ہیں۔ مثلاً ترک منشّیات۔ پاکیزگی عصمت۔ انصاف۔ تحمل۔ ہمّت۔ فیاضی۔ مہمان نوازی۔ صداقت اور خدا پر توکل۔

اللہ تعالیٰ کی مرضی پر توکل رکھنے کے لحاظ سے مسلمان ہمارے لئے نمونہ ہیں۔ اسلام نے ممالک مغرب کی تین لعنتوں نشہ بازی قمار بازی اور بدکاری کو مٹا دیا ہے۔......

اسلام حقیقی اخوت اور مساوات سکھاتا ہے۔ یہ سب سے بڑی ثبوت ہے جو اسلام غیر مسلموں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ نو مسلم فوراً پندرہ کروڑ افراد کی برادری کا حقیقی رُکن بن جاتا ہے۔"

ریورینڈ کینن آئزک ٹیلر نے اپنے اس مضمون کے شایع ہونے کے بعد لندن ٹائمز کو جو ایک چٹھی بھیجی تھی اُس میں لکھا تھا کہ

مُیر اوہ پہلا فقرہ جس پر بہت اعتراض ہوئے ہیں یہ ہے کہ "ایشیا اور افریقہ میں مذہب اسلام بطور ایک تبلیغی مذہب کے بہ نسبت عیسائی مذہب کے زیادہ کامیاب ہے۔ اور ہماری کوششیں مسلمانوں کو عیسائی بنانے میں بے سود ثابت ہوئیں" میں اولاً اپنی بحث ہندوستان سے شروع کروں گا جہاں کے باشندوں کی نسبت تقریباً صحیح اطلاع ہمارے سامنے موجود ہے۔

۱۸۸۱ء اور ۱۸۹۱ء کے درمیان دس برس میں ہندوستان کے مسلمانوں کی آبادی میں قریب بانوے لاکھ چالیس ہزار کی بیشی ہوئی (۹۲,۴۰,۰۰۰) یعنی تقریباً پچیس فی صدی کی شرح سے۔ اُس قدر زیادتی کو جو معمولاً پیدایش کی زیادتی اور اموات کی کمی سے ہوئی اگر ہم محسوب نہ کریں تو وہ نومسلم جو ہندو اور عیسائی مذہب چھوڑ کر اسلام اختیار کرتے ہیں اُن کی تعداد تقریباً چھ لاکھ سالانہ ہے مسلمانوں کے یہاں تنخواہ دار واعظین نہیں ہیں۔ اور نہ کوئی اُن میں بڑی جماعت اس قسم کی ہے جو اپنے مذہب کے پھیلانے میں کمربستہ ہو۔ پس نومسلموں کی یہ بڑی تعداد کچھ تو پرجوش مسلمانوں کی انفرادی کوششوں کا اور کچھ مذہب اسلام کی حقیقی کشش کا نتیجہ ہے۔

برخلاف اس کے باوجود اُس تمام رعب وداب کے جو اُن کو

ایک ہم مذہب گورنمنٹ کے ہونے سے حاصل ہے اور باوجود اخراجات کی اس رقم کثیر کے جو مشنری سوسائیٹوں پر صرف ہوتی ہے کل تعداد نئے عیسائیوں کی بڑی کھینچ تانی سے نو مسلموں کی تعداد کا دسواں حصہ ہے"۔

۵ — این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ



قرآن مجید نے انسان کی روحانی اور اخلاقی اصلاح کے سلسلہ میں جو محیر العقول کرشمے دکھلائے اُن کی ایک ادنیٰ مثال یہ ہے کہ امریکا جیسے تہذیب یافتہ ملک میں وہاں کی گورنمنٹ نے کئی سال تک جبری قوانین کے ذریعہ سے شراب نوشی بند کرنے کی کوشش کی مگر سب کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔ ہندوستان میں مہاتما گاندھی جی نے اپنی ساری قوت شراب نوشی کی مخالفت میں صرف کر دی اور کر رہے ہیں۔ اور اس کام میں ملک کے ہزارہا دولتمند اور قابل لوگ اُن کی مدد میں مصروف ہیں تمام ہندوستان کے مطابع اور اخبارات اُن کے ہم آہنگ ہیں مگر شراب نوشی کے رواج میں بجائے کمی کے اضافہ ہو رہا ہے اور یہ صرف قرآن مجید کی تعلیم کا اعجاز ہے کہ نہ صرف شراب نوشی بلکہ اس سے بھی بدتر افعال قبیحہ ملک عرب سے چند سال کے قلیل عرصہ میں نیست و نابود ہو گئے اور دُنیا بھر کے مسلمان من حیث القوم شراب سے متنفر ہیں۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ

ساتواں باب

بعض اُن امور کا ذکر جو انسانی عقل کی گرفت سے باہر ہیں

اس رسالہ میں ہمارے مخاطب صرف مسلمان نوجوان ہیں۔ جو خدا کو مانتے ہیں وحی کے قائل ہیں اور مذہب اسلام کے پیرو ہیں۔ ہمارا مقصد ہرگز اُن عقلا سے کج بحثی کرنا نہیں ہے جو فوق العقل امور کو نہیں مانتے۔

دُنیا میں جہاں اور بہت سے مذہب رائج ہیں ایک مسلک یہ بھی ہے کہ جو بات خود انسان کی سمجھ میں نہ آئے اس کی صداقت کو تسلیم نہیں کرتے۔ اگر یہ عقلی مسلک دیگر مذاہب کی طرح تعمیری ہوتا اور اپنے پیروؤں کے اخلاقی اور مادی نفع کی خاطر اُن کی رہنمائی کے لیئے ایک نئی اور مفید تر راہِ عمل تجویز کرکے کوئی جداگانہ ہدایت نامہ پیش کرتا تو اس حد تک عقیدہ کا اختلاف چنداں بحث طلب نہ ہوتا۔ مگر یہ مسلک بخلاف دیگر مذاہب کے تخریبی ہے اور اس کا مدعا ہے خدا کا یقین زائل کرنے اور مذہب کی عمارت کو منہدم کرنے کی کوشش کرنا۔ اس مسلک کی دو خصوصیتیں توجہ طلب ہیں ایک تو اپنے محاسن کا دوسروں کو یقین دلانے کی بہ نسبت دوسروں کے عقائد کی کمزوری اور نقائص چننا اور اُن پر نکتہ چینی کرنا آسان تر ہے۔ دوسرے

یہ کہ خدا کے یقین اور مذہب کی پیروی سے انسان کے خیالات اور اعمال پر لازمی طور پر بندشیں عاید ہوتی ہیں۔ اور فطرت انسانی سہولت پسند واقع ہوئی ہے۔ لہذا بندشوں سے رہائی پانے کی خواہش انسان کی فطرت میں غالب ہوتی ہے۔ اور ضروریات زندگی کو مہیا کرنے اور نفسانی رغبتوں کی تکمیل میں وہ چاہتا ہے کہ ہر طرح کی آزادی سے بہرہ یاب ہو۔ اور مادی فوائد کے حصول میں کوئی مزاحمت سدّ راہ نہ ہو۔ اس وجہ سے عقلی مسلک میں ناتجربہ کار نوجوانوں کے لیئے ایک کشش موجود ہوتی ہے۔ لہذا عقائد کے متزلزل کرنے والے اس خطرہ کو پیش نظر رکھ کر محض حفاظت خود اختیاری کے طور پر بعض فوق العقل عقائد پر تھوڑی سی روشنی ڈالنا بے محل نہ ہوگا۔

"خدا"

جس طرح یہ ایک قانون قدرت ہے کہ گرمی سے جسم پھیل کر زیادہ جگہ گھیرتا ہے اور سردی پاکر جسم سکڑتا ہے اور کم جگہ گھیرتا ہے اسی طرح یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ہم کسی چیز سے بغیر دیکھے نہ تو ڈرتے ہیں نہ اُس کی طرف رغبت کرتے ہیں۔ مگر دنیا کے کلیہ قاعدے استثنا سے خالی نہیں ہوتے۔ اور جس طرح مذکورہ بالا قانون قدرت کے خلاف بطور امر واقعہ برف باوجود پانی سے سرد تر ہونے کے ہلکا ہوتا ہے اور پانی کی بہ نسبت زیادہ جگہ گھیرتا ہے

اسی طرح یہ بھی امر واقعہ ہے کہ تقریباً ساری دُنیا اور غالباً تمام ہی نوع انسان کا متفقہ میلان ہے کہ کم از کم ایک نا دیدہ ہستی کی طرف انسان کی رغبت ہے۔ اور رغبت بھی ایسی کہ اور تمام رغبتوں سے فایق۔ اسی ایک نادیدہ ہستی کا خوف بھی ہے خوف بھی ایسا کہ دُنیا کی بڑی سے بڑی چیز بھی ایسی خوفناک نہیں۔ وہ اُسے دیکھ نہیں سکتے لیکن جو کچھ بھی دیکھتے ہیں اس میں اسی کا جلوہ نظر آتا ہے اور جس کو دیکھتے ہیں۔ اس کے وجود میں شک کریں تو کریں لیکن جس کا نور آنکھوں میں سمارہا ہے اس پر بے دیکھے ایسا یقین ہے کہ اس کے خلاف ہزار حجتیں پیش ہوں لاکھ دلیلیں بیان کی جائیں اور انسان عقلی طور پر جواب دینے سے عاجز آجائے مگر یہ یقین فنا نہیں ہوتا۔ اور یہ اعتقاد زائل نہیں ہوتا۔ ؎

آنکھیں تجھکو ڈھونڈتی ہیں دل ترا گرویدہ ہے جلوہ تیرا دیدہ ہے صورت تری نادیدہ ہے
بے حجابی یہ کہ ہر ذرہ میں جلوہ آشکار اس پہ گھونگھٹ یہ کہ صورت آج تک نادیدہ ہے

یہ اعتقاد جاہل اور عالم۔ عامی اور عارف ہر شخص کے دل پر کم و بیش قبضہ کیے ہوئے ہے۔ اور دُنیا کا کوئی حصہ اور زمانہ کا کوئی عرصہ ایسا متحقق نہیں ہوتا جس میں لوگ اس یقین سے قطعاً بے بہرہ رہے ہوں۔ اس لیئے کہا جاسکتا ہے کہ یہ یقین عقل و استدلال سے پیدا نہیں ہوا۔

ہستی باری تعالیٰ کا عقیدہ اگر استدلال پر منحصر ہوتا تو جاہل قوموں میں نہ پایا جاتا۔ بلکہ تہذیب کے ابتدائی مراتب میں بھی اس کا وجود نہ ہوتا۔ حالاں کہ

واقعیت اس کے خلاف ہی اور جہلا کے دلوں میں جس وثوق اور اطمینان کے ساتھ یہ یقین موجود ہوتا ہے وہ بسا اوقات علما کے لیئے قابل رشک ہوتا ہی اس لیئے صاف ظاہر ہی کہ اگر وجود باری تعالےٰ کا یقین عقل و استدلال پر موقوف نہیں اور باوجود اس کے ہر زمانہ اور ہر ملک میں اس عموم کے ساتھ پایا جاتا ہی تو ضرور ہی کہ فطرت انسانی میں دیگر فطری خواہشوں کی طرح یقین بھی ازل سے ودیعت کیا ہوا ہی۔

ایک صاحب بحث کرتے ہیں کہ انسان اپنی جہالت اور وحشت کے زمانہ میں اکثر چیزوں سے خوف کھاتا ہی اور بعض مناظر کو دیکھ کر پسند کرتا ہی کبھی کسی بلا میں مبتلا ہو کر یاس و نا امیدی کا شکار ہوتا ہی کبھی بے انتہا لذت پاتا ہی اور فرط مسرت سے بے اختیار ہوتا ہی۔ مگر اپنی نادانی اور جہالت کے سبب سے ان مناظر کے مادی اسباب و علل معلوم نہیں کر سکتا۔ اور قوانین قدرت کو نہ جاننے اور نیچر کے بے انتہا وسائل کو نہ سمجھنے کے سبب اپنے دل کو تسکین نہیں دے سکتا۔ اور فرط حیرت سے اُن کو کسی مخفی کارکن اور غیر محدود طاقت کی طرف منسوب کرتا ہی اور "روح۔ دیوتا۔ خدا" وغیرہ مبہم الفاظ سے اپنی دانست میں قدرت کا راز دریافت کرلے کا دعویٰ کرنے لگتا ہی۔ یہی خیال باپ سے بیٹے تک متوارث چلا آتا ہی۔ پھر ایسے لوگوں میں سے بڑی

سمجھ بوجھ کے لوگ یا حکام اور مذہبی پیشوا لوگوں کو اپنی اطاعت میں رکھنے اور ان سے ذاتی مفاد حاصل کرنے کی غرض سے اس خیال کو قوی کرتے رہتے ہیں اپنے معبودوں کی عبادت کے قاعدے قانون بناتے رہتے ہیں۔ غرض لوگوں کے غلط خیال اور بیجا خوف اور امیدوں سے ان کی جہالت کا نتیجہ یعنی مذہب پیدا ہوتا ہے اور بڑھتا ہے۔

ان کے نزدیک جو فطری اسباب خدا کا خیال اور مذہب پیدا کرنے کے باعث ہیں مثلاً عجائبات عالم۔ اور باعث تکلیف یا باعث لذت اشیا کا دیکھنا۔ انسان چونکہ اپنی جہالت کی وجہ سے ان کے مادی اسباب اور علل معلوم نہیں کر سکتا لہذا غور و تفکر کرنے کے بعد بطریق استدلال اپنی نادانی سے خدا اور دیوتا کے وجود کا غلط نتیجہ نکال لیتا ہے لیکن اگر خدا کا تصور اور مذہب کا خیال جہالت اور نادانی کے سبب غلط استدلال کا نتیجہ ہوتا تو جیسا دوسرے غلط استدلالوں کی حالت ہے تمدن اور تہذیب کی ترقی سے اس کی غلطی معلوم ہونے لگتی اور بقول ان کے جوں جوں قوانین قدرت اور نیچر کے بے انتہا وسائل کا علم ہوتا جاتا اس غلط استدلال کا ضعف ظاہر ہوتا رہتا۔ اور بتدریج خدا کا خیال اور مذہبی احساس کم ہوتے ہوتے بالکل فنا ہو جاتا کم از کم مہذب قوموں میں سے یہ خیال اور احساس نابود ہو جاتا جیسا کہ بہت سے اور خام عقائد کا حشر ہوا۔ مثلاً انسانی قربانی ستی ہونے کی رسم یا بادشاہوں کی

مطلق العنانی اور اُن کے ناقابل اعتراض آسمانی اختیارات رفتہ رفتہ نابود ہوگئے مگر خدا کے تصوّر اور مذہبی احساس کی یہ کیفیت ہے کہ اول قرآن کے خلاف تلاش کرنے والوں کو آج تک کوئی ایسی قوی دلیل دستیاب نہیں ہوئی جس سے وجود باری تعالےٰ ناممکن ثابت ہو سکے۔ چنانچہ مسٹر چارلس بریڈلا وجود باری کے انکار میں نہایت سرگرم تھے مگر جن کو ممبر پارلیمنٹ بن جانے پر شرکت پارلیمنٹ سے قبل حلف اُٹھانے کی شرط پوری کرنی پڑی اپنی کتاب "فری تھنکرس ٹیکسٹ بک" Free thinkers Text book مطبوعہ ۱۸۸۲ء کے صفحہ ۱۱۸ پر لکھتے ہیں کہ

"منکر خدا یہ نہیں کہتا کہ خدا نہیں ہے۔ بلکہ یوں کہتا ہے کہ میں نہیں جانتا کہ لفظ خدا سے تمہارا کیا مطلب ہے میرے دماغ میں خدا کا خیال موجود نہیں ہے۔ اور لفظ خدا میرے نزدیک ایک ایسی آواز ہے جس کا کوئی صاف اور معین مطلب نہ ہو میں خدا کا انکار نہیں کرتا۔ کیونکہ جو چیز میرے تصور میں نہیں اور جس کا تصوّر ماننے والوں کے دماغ میں بھی ایسا نامکمل ہے کہ وہ اُس کی تعریف و تحدید نہیں کر سکے۔ ایسی چیز کا انکار کیونکر کر سکتا ہوں۔"

دوسرے جس چیز کو وحشیانہ خوف اور تعجب کی پیدایش مانا گیا تھا اُس میں بجائے ضعف اور شک پیدا ہونے کے اور بجائے آہستہ آہستہ فنا ہو جانے کے جیسا کہ

یہ غلط استدلالوں کا حشر ہوا تمدّن اور تہذیب کی ترقی سے اُس میں اور جلا آتی گئی۔ اور قوانین قدرت اور نیچر کے بے انتہا وسائل سے شناسائی ہوتے جانے سے اعتقاد اور ایمان کا راستہ زیادہ صاف ہوتا گیا۔ پہلے زمانہ میں جُہلا کسی عجیب درخت اور خوبصورت پتھر یا کارآمد حیوان کو دیکھ کر اپنا مذہبی میلان اُس طرف متوجہ کر دیتے تھے اور اُن کو خدا مان کر پرستش کرنے لگتے تھے۔ اُن کے بعد جب کثرت مشاہدہ اور عقل و شعور کی ترقی سے ان چیزوں کے خواص دریافت ہونے شروع ہوئے تو اُن کو چھوڑ کر جسمانیت سے بعید اور روحانیت سے قریب تر طاقتوں کو خدا ماننے لگے مثلاً بارش کا دیوتا۔ ہوا کا دیوتا۔ سورج کا دیوتا۔ رفتہ رفتہ ایک ایسی ہستی کی طرف متوجہ ہونے کی اُن میں استعداد پیدا ہوگئی جس کی کوئی مثال نہیں۔ نہ اُسے نظر نے دیکھا نہ علم کی اُس تک رسائی ہی۔

مسٹر چارلس بریڈلا کا یہ قول صحیح ہی کہ خدا کا وجود اُن کے تصوّر کی گرفت سے باہر ہی مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جس وجود کا سراغ مسٹر بریڈلا مجرّد اپنی عقل و تصوّر کے ذریعہ سے نہ پا سکے اس کا پتہ اور کسی ذریعہ سے بھی نہیں چل سکتا۔

مسٹر کارلائل نے لکھا ہی اور سچ لکھا ہی کہ

ہستی کا خوفناک مگر شاندار راز اُن پر (یعنی حضرت محمدؐ پر) منکشف

ہو گیا تھا۔ ابتدا میں سفر اور حضر میں ہزاروں خیالات کا اُن کے دل میں ہجوم تھا۔ میں کیا ہوں؟ یہ دنیا کیا ہے؟ زندگی کیا ہے؟ موت کیا ہے؟ میں کس عقیدے کو مانوں؟ مجھے کیا کرنا چاہیئے؟ ایسے سوالات تھے کہ ہیبت ناک کوہ حرا کی چٹان اور غار حرا کی ہولناک خاموشی اور تنہائی اور وہ بڑے بڑے اجرام فلکی جو خاموشی کے ساتھ نیلی اور روشن آسمانی فضا میں گردش کرتے رہتے ہیں ان کا جواب نہیں دے سکے۔ مدتوں ان سوالات کا کوئی جواب نہیں ملا۔ آخر خدا کے الہام نے حضرت کی کشادگی کی اور آسمانی تائید کی بدولت محمدؐ نے جو نظام قائم کیا اُس کے نتائج دنیا نے دیکھ لیئے''

مشہور مورخ سر ایڈورڈ گبن (مصنف ''تاریخ زوال سلطنت رومۃ الکبریٰ) نے مسٹر کارلائل کے مذکورہ بالا قول کی اس طرح تصدیق کی ہے کہ

''ایک حکیم جو خدا تعالےٰ کے وجود اور اُس کی صفات پر اعتقاد رکھتا ہو مسلمانوں کے مذکورہ بالا عقیدہ کی نسبت یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ ایسا عقیدہ ہے جو ہمارے موجودہ ادراک اور قوائے عقلی سے بڑھکر ہے اس لیئے کہ جب ہم نے اُس نامعلوم چیز (خدا) کو زمان و مکان حرکت اور مادہ۔ حس اور تفکر کے اوصاف سے مبرا کر دیا تو

پھر ہمارے خیال کرنے اور سمجھنے کے لیئے کیا چیز باقی رہ گئی وہ اصل (یعنی توحید ذات وصفات باری تعالےٰ) جس کی بنا عقل اور وحی پر ہے محمد کی شہادت سے استحکام کو پہونچی۔ چنانچہ اُس کے معتقد ہندوستان سے لیکر مراکو تک موحد کے لقب سے ممتاز ہیں"

مسٹر چارلس بریڈلا مسٹر ٹامس کارلائل اور مسٹر ایڈورڈ گبن

تینوں انگلستان کے باشندے ہیں عقیدہ کے اس اختلاف کی بنا پر اگر کسی عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائیں جہاں واقعات اور معتبر شہادتوں کی بنا پر قضا کا فیصلہ ہوتا ہے تو اول الذکر کسی طرح اپنے سے زیادہ ناموران دو ہموطنوں کے مقابلہ میں کامیاب نہ ہوں۔

قرآن مجید کی بتلائی ہوئی ذات باری کے وجود کی ایک ممتاز خصوصیت یہ بھی ہے کہ اُس لاشریک ذات کے لیئے **اللّٰہ** کا ایک ایسا اسم ذات بتلا دیا گیا ہے جو بجز اس خالق کائنات اور معبود حقیقی کے کسی اور ہستی اور وجود کے لیئے استعمال نہیں ہوتا۔ یہ بھی ایک عجیب بات ہے کہ عربی زبان کے سوا اور کسی زبان میں باری تعالیٰ کا کوئی اسم ذات موجود نہیں ہے۔

مسٹر چارلس بریڈلا اور اُن کے ہم خیال عقلا اور ماہرین سائنس

کی خدمت میں ادب سے گزارش ہے کہ آپ صرف اس وجہ سے کہ دور دراز اجرامِ فلکی سے دوسرے اجرامِ فلکی تک روشنی اور حرارت پہونچنے کی کوئی صورت آپ کی عقل میں نہیں آتی۔ لہذا آپ ایک بے دیکھی اور بے سمجھی مجہول شے ایتھر کا وجود جس کا کوئی صاف اور معین مفہوم آپ کے ذہن میں نہیں زبردستی تسلیم کر لیتے ہیں یہ "ایمان بالغیب" نہیں تو اور کیا ہے۔ چونکہ قطب نما کی مقناطیسی سوئی کا ہمیشہ شمال و جنوب رخ رہنا آپ کی سمجھ میں نہیں آتا اس لیے اپنے دل کو سمجھانے کے لیے آپ زمین کے اندر ایک بے دیکھے اور بے سمجھے فرضی مقناطیس کا وجود اور زمین کے چاروں طرف شرقاً غرباً بجلی کی فرضی رو کا وجود بے تکلف مان لیتے ہیں۔

وہ کروڑوں سیارے اور ستارے جن کے وجود کے آپ قائل ہیں مگر جن کی حقیقت اور جن کے حالات کا آپ کو مطلق کوئی علم نہیں اور جو فضائے آسمانی میں اپنے اپنے مقررہ حلقوں میں رات دن گردش کرتے رہتے ہیں اُن کا نظام اور فضا میں معلق رہنا آپ کی عقل کی گرفت سے باہر تھا۔ آپ نے چند حکما کی رائے کے مطابق ایک ایسی بے دیکھی بے سمجھی بوجھی مجہول قوت کشش باہمی کا وجود خوشی سے قبول کر لیا جو آپ کے مشاہدے اور تجربہ کے حدود سے خارج ہے۔ آپ نے آج تک چند متناسب الاوزان اجسام کے مونے بنا کر بطور تجربے کے کبھی نہیں دکھلائے جو کشش اتصال کے ماتحت

فضا میں تھوڑی ہی دیر کے لئے معلق رہیں۔

زمانہ سابق کے ماہرین فلکیات نے اجرام فلکی کے نظام اور ان کی گردش کی بالکل دوسری صورت قرار دے رکھی تھی جس کی صحت پر صدیوں تک لوگوں کو ایسا ہی کامل یقین تھا جیسا کہ آج کل کی تحقیقات پر ہے۔ کشش ثقل و اتصال اگرچہ کسی قدر ہمارے ذہن کی گرفت میں ہے۔ مگر پھر بھی اس خیال کو بالکل مشخص اور متعین کر لینا ہماری طاقت سے باہر ہے۔ خود سر آئزک نیوٹن تسلیم کرتے ہیں کہ کشش ثقل و اتصال ناقابل فہم ہوتی اگر درمیان میں ایتھر کا واسطہ نہ ہوتا۔ مگر ایتھر کو مان کر بھی تو کشش کا اثر سمجھ میں نہیں آتا صرف نامعلوم کو معلوم سمجھ لیا گیا ہے۔ اور علت العلل کو چھوڑ کر سائنس نے بت پرستوں کی طرح برق۔ حرارت کشش اتصال۔ کشش ثقل۔ انرجی وغیرہ متعدد نامعلوم الحقیقت علتیں تسلیم کر رکھی ہیں جنکی بابت کچھ معلوم نہیں کہ یہ خود کہاں سے آئیں اور کیونکر آئیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ مذہب اور سائنس دونوں ناقابل فہمید کو قابل فہمید بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مذہب کا بنیادی اصول ہے "توحید"، اور دوسرے کا "تعدد اسباب کا گورکھ دھندا"!

اب ذرا ان عقل پرستوں کے تحقیق کیئے ہوئے اسباب کی حقیقت پہ نظر ڈالیئے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ گھڑی کو صاحب ارادہ اور صاحب فہم

انسان اپنی قوت سے کوکتا ہے۔ فنر کو انسانی قوت کے ساتھ کوکنے کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ غیر متحرک بال کمانی میں حرکت پیدا ہو جاتی ہے جب کوک ختم ہو جاتی ہے تو اس کے نتیجہ کے طور پر بال کمانی کی حرکت بھی خود بخود بند ہو جاتی ہے بال کمانی کی حرکت کا بند ہونا گھڑی کے بند ہونے کا سبب نہیں ہوتا۔ اسی طرح انسانی تدبیر کی بدولت حرارت اور بھاپ کے ذریعہ سے انجن کا پسٹن حرکت کرتا ہے اس سے انجن چلتا ہے۔ جب حرارت اور بھاپ ختم ہو چکتی ہے تو پسٹن بطور نتیجہ کے رک جاتا ہے۔ پسٹن کا رکنا انجن کی رفتار بند ہونے کا سبب قرار نہیں دیا جا سکتا۔

دنیا کی ابتدا سے آج تک ایسا کھلونا ایجاد نہیں ہو سکا جس میں بغیر انسانی تدبیر اور قوت کے خود بخود حرکت پیدا ہو جاتی ہو اور جب تک کسی ورکشاپ میں ہم مشاہدہ اور تجربہ سے یہ نہ دیکھ لیں کہ بغیر جاندار وجود کی مداخلت کے ہر حالت میں خود بخود حرکت پیدا ہو سکتی ہے۔ اس وقت تک حرکت کو مادّی ذرّات کا ایک خاصہ یا کسی وجود کے عناصر کی نامعلوم خاص قسم کی ساخت کا نتیجہ قرار دینا بالکل ایک فرضی اور ناقابل قبول تاویل سمجھی جائے گی جو بقول مسٹر بریڈلا کے انسانی تصوّر سے خارج ہے۔

چونکہ موت اور حیات کے مسائل عقل انسانی کی گرفت سے قطعاً باہر ہیں لہٰذا اس صدی کا ایک ڈاکٹر موت کا سبب نہ معلوم کر سکنے کی وجہ سے

کہتا ہے کہ فلاں شخص قلب کی حرکت بند ہو جانے کی وجہ سے مرگیا آپ نہایت بھولے پن سے اس بے دلیل اور غیر آزمودہ قول پر ایمان لے آتے ہیں حالانکہ قلب کی حرکت کا بند ہو جانا موت کا نتیجہ ہونا چاہیئے نہ کہ موت کا سبب۔

اگر مجرد قلب کی حرکت زیست کا سبب ہوتی تو قلب کو برقی قوت کے ذریعہ سے متحرک رکھنا چنداں مشکل کام نہ تھا آخر یہ قلب پہلے کیوں حرکت کرتا تھا اور وفعتاً بات کرتے کرتے خود بخود کیوں بند ہو گیا۔ حالانکہ سائینس کا مسلمہ اصول ہے کہ نہ تو ساکن شے خود بخود حرکت میں آسکتی ہے نہ متحرک شے بغیر خارجی اسباب کے خود بخود ٹھہر سکتی ہے۔

ایک معمولی آدمی کہتا ہے کہ وہ آدمی موت سے مرگیا۔ ڈاکٹر کا قول ہے کہ قلب کی حرکت بند ہو جانے سے مرگیا۔ ان دونوں اقوال میں عملاً کیا فرق ہے دونوں ایک بے سمجھا اور عقل و حکمت کی گرفت سے باہر ایک ایسا سبب تجویز کرتے ہیں جو دونوں کے قابو سے یکساں باہر ہے۔ اور دونوں اس واردات کی روک تھام سے یکساں عاجز ہیں۔

دُنیا کے ایک سب سے بڑے زبردست بادشاہ کے پہلو میں درد اُٹھتا ہے اُس کے چاروں طرف کھڑے ہوئے دنیا کے ہر حصہ سے آئے ہوئے بڑے بڑے نامور ڈاکٹر اور طبیب غور سے اُس کی حالت اپنی آنکھوں سے

دیکھ رہے ہیں۔ نہایت لطیف آلے تشخیص مرض کی غرض سے استعمال ہو رہے ہیں۔ نہایت قیمتی ادویات سے کام لیا جارہا ہے۔ مگر بادشاہ سلامت بدستور درد سے تڑپ رہے ہیں اور یہ تمام ڈاکٹر اور طبیب بالکل بیکس اور عاجز ایک معمولی تیماردار کے مانند خاموش کھڑے ہیں۔ نہ مرض سمجھ میں آتا ہے نہ کوئی چارۂ کار سوجھتا ہے۔ بادشاہ اسی حالت میں مرجاتا ہے اب اُس کے مرنے کے بعد ڈاکٹر صاحبان نہایت اطمینان سے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق اُس کی موت کے وجوہ قرار دے کر اخبارات میں شائع کرتے ہیں کہ ہز مجسٹی کا فلاں مرض سے انتقال ہوگیا۔ جس طرح صوبہ بہار کے بھونچال کی حشر انگیزیاں ختم ہونے کے بعد عقلا اُس کے اسباب کے متعلق اب قیاس آرائیاں فرمارہے ہیں۔ گویا یہ حضرات اس بھونچال کی ماہیت اور اسباب اس طرح سمجھ گئے ہیں کہ اب دنیا میں کبھی بھونچال آنے ہی نہ پائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس موت کے راز سے حکما اور عقلا اُسی قدر ناواقف ہیں جس قدر زیست کے راز سے۔

آنحضرت صلعم پر بذریعہ وحی کے جو آیتیں سب سے پہلے نازل ہوئیں اُن میں اللہ تعالےٰ نے اپنی قدرت کاملہ کی سب سے بڑی صنعت خالقیت کی طرف انسان کو متوجہ کیا ہے جو اس کی عقل و ادراک سے بالاتر ہے۔ اور جس کا راز نہ آج تک کسی حکیم نے سمجھا ہے اور نہ آیندہ کوئی سمجھے گا۔ ارشاد ہوتا ہے۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ۔ کوئی ڈاکٹر اور کوئی طبیب یہ بات اس طرح

نہیں سمجھا سکتا کہ اُس کا کوئی معین تصوّر یا مفہوم دماغ انسانی میں سما جائے کہ مرد اور عورت کے تخم ہائے انسانی ایک جگہ ہونے کے بعد ایک غیر متحرک اور منجمد خون کا لوتھڑا بن کر اُس سے متحرک جان دار اور سمجھدار انسان کیونکر بن جاتا ہے۔ نامعلوم کو معلوم ثابت کرنے کی غرض سے جس قدر تاویلات کی جاتی ہیں وہ بے ثبوت اور بے نتیجہ اور انسانی عقل کی گرفت سے باہر ہیں۔

مکھی مچھر اور چیونٹی بنانا تو رہا ایک طرف کسی نے آج تک ایک سیدھا سادہ متحرک برساتی کیڑا بھی بنا کر نہیں دکھلایا۔ جو ماہر فن مصور ایک چڑیا کی تصویر نہ کھینچ سکے۔ جو بڑھئی ایک اسٹول نہ بنا سکے۔ جو سنار ایک چھلّا نہ گھڑ سکے جو لوہار ایک لوہے کی کیل بنانا بھی نہ جانتا ہو ان حضرات کا اپنے اپنے فن کے متعلق اصول اور نظریے بیان کرنا اور منطقی دلائل سے اپنے نظریوں کو ثابت کرنے کی کوشش کرنا اُن کی فنّی واقفیت کا کسی کو یقین نہیں دلا سکتا۔ اُن کی جودت طبع کی داد دی جا سکتی ہے مگر ان فنون سے حقیقت میں وہ اسی قدر ناواقف ہیں جتنا کہ ایک بے پڑھا لکھا دیہاتی۔ اسی طرح اطبائے جدید کا یہ دعوے کہ وہ زیست اور موت کے اسباب سمجھ گئے ہیں۔ حالانکہ نہ وہ ایک متحرک کیڑا بنا کر دکھلا سکتے ہیں نہ وہ ایک قریب المرگ کیڑے کی موت ملتوی کر سکتے ہیں۔ تو عملی دنیا اُن میں اور ایک جاہل میں کوئی تمیز نہیں کر سکتی۔ ایک نامور شاہی طبیب سے کسی نے سوال کیا تھا کہ آپ بھی

مریضوں کا علاج کرتے ہیں اور فلاں عطار بھی علاج کرتا ہے۔ آپ کے علاج سے بھی کچھ مریض شفایاب ہو جاتے ہیں اور کچھ مر جاتے ہیں۔ اور اُس عطار کے علاج سے بھی کچھ مریض اچھے ہو جاتے ہیں اور کچھ جانبر نہیں ہوتے۔ اسی صورت میں آپ میں اور اُس عطار میں کیا فرق ہے۔ حکیم صاحب اس کا صرف یہ جواب دے سکے وہ مریضوں کو بے ضابطہ مارتا ہے اور میرے مریض ضابطہ کے اندر مرتے ہیں اسی طرح جو حکیم یہ بتاتے ہیں کہ انڈے سے بچہ اس طرح بنتا ہے اور منجمد خون کے لوتھڑے سے آدمی اس اس طرح بن جاتا ہے ان کی موت و زیست کی حقیقت سے ناواقفیت "طلائی" نہیں جا سکتی ہے اور معمولی کسان کی ناواقفیت کو "نکالی" قرار دے سکتے ہیں۔ ورنہ جس طرح آکسیجن اور ہائیڈروجن ملا کر پانی بنا کر دکھلا دیتے ہیں اسی طرح جب تک ایک متحرک جاندار کیڑا یا مصنوعی انڈے سے مرغی کا بچہ نکال کر نہ دکھلا دیں اُن کے علم کا دعویٰ غیر معتبر رہے گا۔

اب آخر میں عقلی مسلک کے پیروؤں سے ہمارا ادب سے یہ سوال ہے کہ حضرت ابراہیمؑ۔ حضرت موسیٰؑ۔ حضرت عیسیٰؑ۔ اور حضرت محمد صلعم جو کہ عظیم الشان تاریخی ہستیاں ہیں۔ فرضی وجود نہیں ہیں جنھوں نے بنی نوع انسان کی رہنمائی کی ہے۔ اور جن کے نام کی عظمت کرنے والوں اور جن کی ہدایات پر عمل کرنے والوں سے دنیا بھری ہوئی ہے انھوں نے خدا کے وجود سے آگاہ ہو کر خود بھی اُس کی پرستش کی اور اپنی اُمتوں سے بھی اُس کی پرستش کرائی

کیا یہ سب کھیل تھا شعبدہ بازی تھی۔ فریب تھا مصلحت تھی یا جھوٹ تھا کیسی بے انصافی اور ضد کی بات ہے کہ مثلاً سر آئزک نیوٹن کا نظریہ (تھیوری) Theory ایک مشاہدہ اور سمجھ میں نہ آنے والی قیاسی اور مجہول تحقیقت کشش اتصال کی بابت ماننے کے لیے ہمارے عقل پرست بزرگ تیار ہیں۔ مگر سچے اور راست باز پیغمبروں کے بتلائے ہوئے مشاہدہ اور تجربہ پر مبنی واقعات (فیکٹ) Fact کا صاف انکار۔

جب موت و زیست کے پیش نظر وارداتوں کو حکما نہیں سمجھ سکتے اور اس میں مداخلت کی قدرت نہیں رکھتے تو خدا کا جو کہ ہر قسم کی تعینات سے مبرا ہے اس کا عقل انسانی کی وسعت میں نہ سما سکنا کونسی انوکھی بات ہے

جو لوگ ایتھر برق۔ انرجی کشش ثقل و اتصال وغیرہ کے بن دیکھے عملی وجود کو جن کی حقیقت اور جن کی علت سمجھ میں نہیں آتی۔ بہ آسانی تسلیم کر لیتے ہیں اور نامعلوم کو معلوم سمجھ لیتے ہیں ان کی زبان سے خدا کے وجود کا انکار کم سے کم تعجب انگیز ضرور ہے۔

فلسفی سرِ حقیقت نتوانست کشود گشت رازِ دگر آں راز کہ افشا مے کرد

وحی

یہ امر واقعہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر پورا ایمان نہیں ہو سکتا جب تک وحی پر ایمان نہ ہو۔ وحی الٰہی خالق اور مخلوق کے درمیان سچا تعلق پیدا کرتی ہے

اور اللہ تعالیٰ پر ایمان کامل صرف وحی کی بدولت پیدا ہوتا ہی۔ ذات باری کا یقین استدلال سے پیدا نہیں ہو سکتا۔ عقل ایسے جوہر کو پیدا کرنے کے قابل نہیں۔ بڑے بڑے نامور حکیم اور فلسفی سقراط۔ افلاطون اور ارسطو وغیرہ عقل کی رہنمائی سے بت پرستی کی گمراہی پہچان سکے مگر اُن کی عقل کی پرواز انھیں توحید کے اعلیٰ مقام تک نہ پہونچا سکی۔ چنانچہ ان حکماء نے کسی صراط مستقیم کا سراغ نہ پایا۔ اور وہ اپنے شاگردوں کے واسطے کوئی دینی مسلک تجویز نہیں کر سکے۔ اسی وجہ سے کوئی مذہب اُن سے منسوب نہیں ہی۔ خالی نظارہ قدرت سے انسان یہ اقرار کر سکتا ہی کہ قدرت یا مناظر قدرت کا کوئی صانع ہی۔ مگر اُس نظارہ سے وہ یقین پیدا نہیں ہوتا جس سے عمل کی قوت پیدا ہوتی ہی جس کے نمونے آنحضرت صلعم اور آپ کے صحابہؓ نے دُنیا کے سامنے پیش کیے اور جن نمونوں سے دُنیا کبھی خالی نہیں رہی۔ غرض ایسا ایمان عقل انسانی کی رسائی سے باہر ہی۔ وہ صرف اُس تعلق کے قایم ہونے سے پیدا ہوتا ہی جو فی الواقع خالق اور مخلوق میں ہی اور اُس کے حصول کا واحد ذریعہ وحیِ الٰہی ہی۔

وحی کے متعلق انگلستان کے ذی فاضل اور نامور محققوں مسٹر کارلائل اور مسٹر ایڈورڈ گبن کا یہ اعتراف اوپر نقل ہو چکا ہی کہ اللہ تعالےٰ کے وجود اور اُس کے صفات کا عقیدہ انسان کے ادراک اور قوائے عقلی کی رسائی سے بلند تر ہی۔ اور یہ کہ توحید ذات و صفات باری تعالیٰ

کا یقین حضرت محمدؐ کی شہادت سے استحکام کو پہونچا۔

بظاہر انسان کی جملہ معلومات کا دارو مدار صرف اس کے حواس خمسہ پر ہے جن کے پانچ آلے آنکھ۔ ناک۔ کان۔ زبان اور جسم انسان کے قبضے اور تصرف میں ہیں۔ جس وقت ہمارے حواس کے یہ آلے کام نہیں دیتے اُس وقت ان حواس سے اعلیٰ تر قوت یعنی عقل انسان کی رہنمائی کرتی ہے مثلاً آنکھ جو بینائی کا آلہ ہے سب سے زیادہ دور رس اور سب سے زیادہ کارآمد آلہ ہے جو تجربہ کی بدولت باقی اور چاروں آلوں کا کام بھی دے دیتا ہے لیکن یہی آنکھ ہوا کو بھاپ کو اور گھڑی کی سوئی کی رفتار کو محسوس نہیں کر سکتی سیاروں اور سایۂ دیوار کی حرکت بھی نہیں دیکھ سکتی۔ نیز بغیر مادی اجسام کی موجودگی کے فضا میں روشنی کے وجود کا بھی احساس نہیں کر سکتی۔ ان مواقع پر حواس سے برتر عقل رہنمائی کرتی ہے اور علم کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اسی طرح عقل سلیم جن امور کے ادراک سے عاجز ہوتی ہے یا اُن کے متعلق غلط حکم لگاتی ہے تو اُس سے بھی اعلیٰ تر قوت انسان کی رہنمائی کرتی ہے اور وہ یا تو قوت ربانی ہو سکتی ہے یا کشف اور وحی

حضرت انسان جن کو اپنی عقل پر اتنا ناز ہے کہ خدا کو خدائی سے معزول کرنے پر تلے ہوئے ہیں خود اُن کی حقیقت یہ ہے کہ آپ نظام شمسی کے ایک چھوٹے سے سیارے پر آباد ہیں اور خبر سے آپ اتنا جانتے ہیں کہ اس نظام شمسی میں زمین سے بہت بڑے بڑے سیارے موجود ہیں جن تک آپ کی عقل

نہیں پہونچ سکتی۔ اور اس وجہ سے اُن کا آپ کو کوئی علم نہیں ہے آپ کے زعم میں ان عظیم الشان سیاروں پر کوئی مخلوق آباد نہیں ہے بلکہ خالی ہنڈولے کی طرح آفتاب کے گرد محض اس وجہ سے چکّر لگاتے رہتے ہیں کہ زمین پر رہنے والے چند نفوس کبھی کبھی دوربین کے ذریعہ سے (بشرطیکہ ابر محیط آسمان نہ ہو) اُن کی سطح کا کوئی حصّہ دیکھ کر قیاس آرائیاں کیا کریں۔ اسی پر بس نہیں۔ آپ کو یہ بھی تسلیم ہے کہ اس نظام شمسی جیسے اور سیکڑوں نظام شمسی فضا میں تیر رہے ہیں۔ جن تک دوربینوں کی بھی رسائی نہیں ہے۔ غرض عالم کی وسعت کے لحاظ سے حضرت انسان کی حیثیت ایک گولر کے بھنگے (یا کنوئیں کی مینڈک سے زیادہ نہیں ہے مگر دعوے یہ ہے کہ جو بات آپ کی عقل میں نہ سمائے وہ ناممکن اور محال۔

خیر یہ تو دور کی باتیں تھیں۔ حضرت انسان کو خود اپنے گھر کی خبر نہیں کہ آپ کو اپنے جسم سے کیا تعلق ہے۔ آپ جس چیز کو "میں" سے تعبیر کرتے ہیں خود آپ کو اپنی اس "میں" کا کچھ پتہ نہیں کہ وہ کیا چیز ہے۔ جب آپ کا وزن چند سیر تھا تب بھی آپ اپنے آپ کو "میں" فرماتے تھے۔ اور جب جوانی میں آپ تین من پختہ ہو گئے تب بھی آپ وہی "میں" رہے۔ آنکھ۔ کان۔ ناک سب جاتے رہے۔ ایک بازو کٹا۔ دوسرا بازو کٹا۔ ایک ٹانگ کٹی دوسری کٹی صرف لوتھڑا باقی رہا مگر اُس میں جان ہے تب بھی آپ کی "میں" میں کوئی

فرق نہیں آیا۔ لہذا آپ کے جسم کا کوئی جزو یا کل جسم جو ہمیشہ گھٹتا بڑھتا اور تبدیل ہوتا رہتا ہے "میں" نہیں تو پھر آخر یہ "میں" آپ کس چیز کو کہتے ہیں۔
آپ سو رہے ہیں۔ آپ کے پانچوں حواس معطل ہیں۔ آپ کی آنکھیں بند ہیں۔ کوئی آپ کا نام لیکر پکارے تو کان نہیں سنتے۔ جسم کو کوئی چھوتا ہے تو آپ کو خبر نہیں ہوتی۔ اسی طرح ذائقہ اور شامہ بھی دونوں معطل ہیں مگر آپ کلکتہ کی سیر میں مصروف ہیں۔ آنکھیں کان۔ ناک وغیرہ سب اپنا اپنا کام نہایت مستعدی سے دے رہے ہیں۔ یہ سیر کرنے والے کون ہیں۔ یہ نئے حواس خمسہ کہاں سے آگئے اور ان کے آلے جسم کے کس حصہ میں پنہاں تھے ان کی کچھ خبر نہیں۔ خواب کی ہزار کوئی تاویلیں آپ کو سمجھائے مگر بہت سے ایسے خواب نکلیں گے مثلاً آئندہ پیش آنے والے واقعات کا قبل از وقوع مشاہدہ یا اطلاع ہو جانا وغیرہ جو اُن تاویلات کے احاطہ سے باہر ہیں۔
جسم جوں کا توں مگر آپ مر جاتے ہیں۔ اس واردات کی حقیقت کو کوئی نہیں سمجھ سکتا کہ آپ میں کیا تبدیلی واقع ہو گئی۔ ماں کے پیٹ کے اندر آپ کے غیر متحرک ابتدائی جرم میں کیا نئی چیز داخل ہو گئی جس نے آپ کو متحرک کر دیا۔ اور کیا چیز آپ میں سے کم ہو گئی کہ آپ مر گئے۔ حکما لاکھ آپ کی اس تعمیر و تخریب کے طریقے سمجھائیں مگر حقیقت میں اس بھید سے ناواقف ہیں۔ اگر اُن کو واقفیت ہوتی تو اس تعمیر و تخریب میں کچھ دست اندازی

کر سکتے مگر یہ دونوں واردات (زیست اور موت) اُن کے دسترس سے بالکل باہر ہیں۔ اگر یہ رازِ فی الحقیقت اُن کی سمجھ میں آگیا ہوتا تو کم سے کم ایک برساتی کیڑا یا پانی کی جونک بنا کر دکھاتے۔ جن کی ساخت بہت سادہ ہے۔

یہ بتلانا آسان ہے کہ جرمنی کے نیل میں فلاں فلاں عناصر ہیں۔ یا یہ کہ کوئلے اور ہیرے کے اجزا بالکل متحد ہیں۔ مگر ہندوستان اور انگلستان کا کوئی ماہرِ فن جرمنی کا سا نیل نہ بنا سکا۔ اور نہ آج تک کسی سائنس داں نے کوئلے سے ہیرا بنا کر دکھایا۔ پھر ایسی واقفیت اور ایسا علم آخر کس کام کا؟

پھر عقل انسانی کے فیصلے کس قدر تغیر پذیر ہیں۔ کبھی بڑے بڑے حکماء نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ دنیا میں چار عناصر ہیں۔ زمین ساکن ہے اور عالم کا مرکز ہے چاند سورج اور افلاک زمین کے گرد گردش کرتے ہیں۔ سیاروں میں روح کا وجود تسلیم کیا جاتا تھا جو اُن کی حرکت کا سبب قرار دیا جاتا تھا۔ مدت ہائے دراز کے بعد اب وہی عناصر مرکب ثابت ہوئے۔ بجائے زمین کے سورج مرکز بن گیا۔ اور زمین متحرک ہو گئی۔ زمانہ سابق میں عقل کے نتائج پر اتنا ہی پختہ اعتماد تھا۔ جتنا آج کل کی تحقیقات عقلی پر ہے۔

سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ جب عقل انسانی مادیات کے تعلقات کا پتہ لگانے میں عاجز ہوتی ہے تو پھر انسان دور از کار قیاسات کا سہارا ڈھونڈتا ہے اور خود ساختہ مفروضات پر قناعت کر لیتا ہے۔ مگر اپنی عقل کے

عجز کے اعتراف کو اپنی کسرِ شان سمجھتا ہے۔ مثلاً اجرام سماوی سے روشنی اور حرارت زمین تک پہونچنے کے لیئے فضا میں ایک بے دیکھی اور بے سمجھی ایتھر کے وجود کا نظریہ۔ جس کی حقیقت کسی کو معلوم نہیں۔ اور جس کا کسی نے مشاہدہ اور تجربہ نہیں کیا اور نہ یہ سمجھ میں آتا ہے کہ بغیر ایتھر کے روشنی کیوں نہیں پھیل سکتی اور ایتھر کے وجود سے پھیلنے میں کیوں مدد مل جاتی ہے۔ اس قسم کی مثال کا ذکر کرنے سے ہمارا صرف یہ مطلب ہے کہ انسان کو ایسے موقعے بھی پیش آتے ہیں کہ اُس کی عقل کام نہیں دیتی تو قیاس کے گھوڑے دوڑانے لگتا ہے۔ حالانکہ جس طرح حواس کی نارسائی کے وقت عقل سے مدد لی جاتی ہے اسی طرح عقل کی پرواز ختم ہونے پر اُس سے اعلیٰ رہنما کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور وہ رہنما وحی ہے۔

اگر کسی امر کا وقوع مشاہدہ یا قابل اطمینان شہادت سے متیقن ہو جائے تو ہم کو لامحالہ امر مذکور تسلیم کرنا پڑتا ہے گو وہ بظاہر عقل اور ایک مسلمہ اصول کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ انگلستان کے مشہور مصنف مسٹر ایڈیسن کا بھوت کے عقیدے کے متعلق یہ قول ہے کہ اگر میرا دوست ایک ایسا شخص ہے جو ہمیشہ سچ بولتا ہے۔ سنجیدہ شخص ہے، عقلمند ہے اور میں اُس کی ننانوے باتیں معتبر سمجھتا ہوں اگر وہ دوست بھوت کے وجود کے متعلق اپنی چشم دید کوئی واردات بیان کرے تو آخر کیا وجہ ہے کہ اُس کی صرف ایک اس بات کا میں یقین

نہ کروں۔ اور اس کے صرف اس بات کو جھوٹ سمجھ لوں۔

سائنس میں بھی بعض امور ایسے پائے جاتے ہیں کہ اگر اُن کے وقوع کا ثبوت نہ ہوتا تو قانون قدرت کو اٹل اور ناتغیر پذیر ماننے والے لوگ عقل کی رو سے اُن کے خلاف حکم لگاتے۔ مثلاً قدرت کا قانون ہے کہ سردی سے جسم سکڑتا ہے اور گرمی سے پھیلتا ہے۔ اس قانون کے مطابق ہم اس نتیجہ پر پہونچتے کہ برف پانی سے بھاری ہوگا۔ اور پانی کی بہ نسبت کم جگہ گھیرے گا۔ مگر عقل اور قانون قدرت کے خلاف صرف مشاہدہ نے ہمیں ایک غیر متوقع صداقت کو تسلیم کرنے پر مجبور کیا۔

اسی طرح وحی کا وجود تسلیم کرنے والی اتنی بڑی بڑی تاریخی ہستیاں ہیں یا جن کی شہادت قبول نہ کرنا حق وصداقت کے انکار کے مترادف ہے۔ حضرت ابراہیمؑ۔ حضرت عیسےٰؑ۔ حضرت موسیٰؑ اور رسول خداؐ کوئی معمولی ہستیاں نہ تھیں خصوصاً رسول خدا اور اُن کے اصحاب کے حالات تو نہایت تفصیل اور شرح وبسط کے ساتھ اُن کے معاصرین کے قلمبند کیئے ہوئے ہم تک پہونچے ہیں ایسی جیتی جاگتی چشمدید شہادتوں سے بہتر کسی وقوعہ کی اور کیا شہادت ہو سکتی ہے۔ اگر اسلام کی ابتدائی حالت میں آنحضرتؐ پر وحی کے نزول اور وحی کے ذریعہ معلوم کی ہوئی خبروں اور پیشین گوئیوں پر مسلمانوں کو از روے مشاہدہ یقین کامل نہ ہوتا تو تیرہ - چودہ برس تک شدید مصائب کے حالات میں اسلام

اُن کا قایم رہنا سراسر دشوار تھا۔ اگر ایسی چشمدید شہادتوں کا اعتبار ساقط ہوجائے تو پھر دنیا میں مقدمات کا صحیح فیصلہ کرنا بہت ہی دشوار ہوجائے مسلمان خدا کی ذات وصفات پر ایمان رکھتے ہیں۔ لہذا اُن کے لیئے وحی جیسے امر واقعہ کے عقیدہ میں کسی قسم کا تکلف یا گرانی نہیں ہے۔

"مذہب"

مسٹر جان اسٹوارٹ مل جو میدان آزاد خیالی کے شہسوار ہیں اور مذہب کے داخل فطرت ہونے سے کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں اور جن کی درسی کتاب "لبرٹی" بہت سے ہندوستانی تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دلوں میں جوش حریت اور آزادی کی دھن پیدا کرنے کی ذمہ دار ہے وہ اپنی "ایسے" Essay (مضمون) کے مطبوعہ ۱۸۷۴ء کے صفحہ ۱۰۴ پر فرماتے ہیں کہ

> جب تک انسانی زندگی انسانی تمناؤں کو بر لانے کے ناقابل ہے تب تک یہاں کی کامیابیوں سے بالاتر لذائذ کا اشتیاق قایم رہے گا اور تب تک اس اشتیاق کو صحیح تسکین مذہب سے حاصل ہوگی جب تک دنیاوی زیست تکالیف سے معمور ہے تسلی کی ضرورت رہے گی جو خودغرضوں کو بہشت کی اُمید سے اور بارسا لوگوں کو خدا کی محبت سے حاصل ہوگی"

نام نہاد لامذہب لوگ مذہب پر غور کرتے ہوئے اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ

مذہب یا خدا کا یقین انسانی فطرت میں داخل نہیں ہے لیکن نوع انسان کو پابند مذہب دیکھ کر اُس کی وجہ تلاش کرتے ہیں اور جس طرح عیسائی پادری صاحبان اسلام کی ناقابل انکار کامیابی کو اُس کے اصلی سبب سے جدا کر کے اُس کا ایک فرضی اور خود تصنیف سبب "زورِ شمشیر" قرار دے کر اُسے غیر الہامی ثابت کرتے ہیں اسی طرح عقلی مسلک کے پیرو مذہب پیدا کرنے والے وجود تلاش کر کے محض اس بنا پر کہ اُن کو وہ وجوہ معلوم ہو گئے ہیں مذہب کو غیر فطری قرار دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو امور ایجادِ مذہب کے اسباب قرار دیئے جاتے ہیں۔ مثلاً عجائبات عالم یا تکلیف اور راحت خوف اور اُمید دلوں میں پیدا کرنے والے خارجی اسباب سب فطری ہیں۔ اور ان اسباب سے انسان کا متاثر ہونا بجائے خود تقاضائے فطرت ہے۔ چنانچہ انسان کا اپنی تمنّاؤں کو بر لانے کے ناقابل ہونا۔ یہاں کی کامیابیوں سے بالاتر لذائذ کا اشتیاق قائم رہنا۔ اور انسانی زندگی کا تکلیف سے خالی نہ رہنا یہ تمام اسباب بھی فطری ہیں۔ انسان کے خود اپنے پیدا کیئے ہوئے نہیں ہیں۔ لہٰذا جو نتیجہ ان فطری اسباب پر مترتب ہوتا ہے۔ یعنی مذہب وہ بھی فطری ہونا چاہیئے۔

بھوک اور پیاس انسان و حیوان کے سب سے مقدم فطری خواہشات ہیں اگر کوئی یہ کہے کہ ہم نے بھوک اور پیاس کے وجوہ کا پتہ لگا لیا ہے یہ خواہشیں معمولی اسباب پر منحصر ہیں۔ ان میں کوئی خاص اہمیت نہیں ہے تو

اس قول سے بھوک اور پیاس کا غیر فطری خواہش ہونا ثابت نہیں ہوتا مثلاً کوئی ہم کو یوں سمجھانے لگے کہ کھانا اور پانی معدہ میں پہونچکر معدہ کی حرارت سے تحلیل ہو جاتا ہے۔ اور تحلیل ہونے کے بعد مخارج کے ذریعہ جسم انسانی سے باہر نکل جاتا ہے۔ خالی معدہ خشک رہ جانے اور سکڑنے سے ایک طرح کی تکلیف اور اضطراب کو انسان و حیوان محسوس کرتے ہیں اور اسی بے چینی اور اضطراب کا نام بھوک اور پیاس ہے اور کچھ نہیں بھوک اور پیاس کی اس تشریح سے کسی طرح یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ یہ خواہشیں غیر فطری ہیں۔ اسی طرح مذہب پیدا کرنے کے اسباب دُنیاوی تکالیف اور راحت وغیرہ سمجھ میں آجانے سے مذہب کو غیر فطری جذبہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔

جب مذہب کی پیدایش کے اسباب فطری اور انسانی قابو سے بالاتر ہیں تو اُن اسباب کے نتائج کے فطری ہونے سے بھی انکار نہیں ہو سکتا۔

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے مذہب کے وجود سے انسان کے خیالات اور اعمال پر بندشیں عائد ہوتی ہیں اور فطرت انسانی سہولت پسند ہے۔ اور بندشوں سے رہائی پانے کی قوی خواہش انسان میں پائی جاتی ہے۔ اس لحاظ سے چاہیئے تھا کہ مذہب کے خیال کو زائل کرنے کی کوشش آسانی سے کامیاب ہوتی۔ مگر زمانہ چکر کھاتا ہوا چلا جا رہا ہے اور مادی علوم و فنون ترقی کرتے جا رہے ہیں اور عقلی مسلک کے پیرو زبان و قلم سے مدّت دراز سے ایڑی

چوٹی کا زور لگا رہے ہیں لیکن پھر بھی اس خوش گوار اور دلفریب آزادی کو پسند کرنے والوں اور اُن کے نئے معتقدین کی تعداد کو ان لوگوں کی تعداد سے مقابلہ کیا جاوے جو باوجود آزادی کی فطری خواہش اور پرستاران آزادی کی پیہم کوششوں کے مذہبی دائرہ سے قدم باہر نہیں نکالتے تو اوّل الذکر گروہ کی تعداد الشاذ کالمعدوم کا مصداق ثابت ہو گی۔ اس واقعہ سے عاجز ہو کر ان آزادی پرست بزرگواروں کو اپنے خلاف اہل مذہب کی بے انتہا کثرت دیکھ کر اس کی وجہ تلاش کرتے ہوئے بے اختیار وہی کہنا پڑتا ہے جو مسٹر جان اسٹوارٹ مل کو کہنا پڑا کہ

جب تک انسانی زندگی انسانی تمناؤں کو بر لانے کی ناقابل ہے تب تک یہاں کی کامیابیوں سے بالاتر لذائذ کا اشتیاق قائم رہے گا اور تب تک اس اشتیاق کو صریح تسکین مذہب سے حاصل ہو گی جب تک دنیاوی زیست تکالیف سے معمور ہے تسلی کی ضرورت رہے گی۔ جو خود غرضوں کو بہشت کی اُمید سے اور پارسا لوگوں کو خدا کی محبت سے حاصل ہو گی "

مسٹر بریڈلا اور اُن کے معتقدین نے عجائبات عالم کو مذہب کا محرک ماننے کے بعد پیشوایان مذہب اور ارا کین سلطنت کی تعلیم و ترغیب کو بھی قیام واشاعت مذہب کا سبب گردانا ہے تاکہ اُن کے ذریعہ سے

لوگوں کو اپنی اطاعت میں رکھیں اور اُن سے ذاتی مفاد حاصل کریں۔ مگر پیشوایان مذہب کے بنائے ہوئے دیوتا اور اُن کی تعلیم کردہ تمدنی معاشرتی اور مذہبی رسوم اور پابندیاں جن پر کبھی سختی سے عمل تھا تہذیب و تعلیم کی بدولت ایک ایک کرکے نابود ہوگئیں اور ہوتی جارہی ہیں اور اُن پیشوایان مذہب اور ارکین سلطنت کا اثر مانع نہ ہوسکا۔ بلکہ تہذیب کی ترقی نے خود اُن بزرگوں اور اُن سے بڑھ کر خودسر بادشاہوں تک کی برتری اور خودمختاری کی وقعت کو دلوں سے مٹا دیا۔ مگر مذہب نہ صرف نابود ہونے سے محفوظ رہا بلکہ اور روشن تر ہوگیا۔

مذہب اور اخلاق

انسان کی فطرت ایسی خودغرض واقع ہوئی ہے کہ اپنے فائدہ سے صرف اُس صورت میں دست بردار ہوتا ہے جب اُس سے بہتر کسی اور فائدہ کی توقع ہو۔ یا کسی بڑے نقصان کا اندیشہ ہو۔ اسی طرح کاشتکار اور تاجر کو اگر اپنا ذاتی نفع پیش نظر نہ ہوتا تو صرف دوسروں کے نفع کی خاطر وہ ہرگز محنت کی تکلیف برداشت نہ کرتے۔ طالبعلم آئندہ نفع کی اُمید میں برسوں جانفزا محنت کرتا ہے۔ انسان جانوروں کو اپنی غذا بناتا ہے اور اس طرح بے شمار مخلوق کو نقصان پہونچا کر خود فائدہ اُٹھاتا ہے۔ مگر چونکہ اپنا کوئی اور بڑا فائدہ ہاتھ سے نہیں جاتا یا کوئی بڑا نقصان عاید نہیں ہوتا اس لیئے اوروں کے

نقصان کی مطلق پرواہ نہیں کرتا۔ بلکہ خود اپنی قوم کی بھی پرواہ نہیں کرتا
عام ضرورت کی چیزیں مہنگے داموں خرید کر اپنے صرف میں لاتا ہے اور غریبوں
کی مطلق پرواہ نہیں کرتا۔ نہ اون کی کوئی رعایت کرتا ہے جبکہ دنیاوی امور
میں صورتِ حال یہ ہے تو ایک لحظہ کے لیئے مذہب کو مٹانے کی کوشش
کو بارآور مان لیجیئے۔ اور خدا کا وجود اور اُس کی سزا و جزا کی طاقتوں کو معدوم
فرض کر لیجیے۔ اُس وقت جو لوگ دوسروں کا مال چھیننے اور اُن کی جان و
آبرو لینے میں اپنا فائدہ تصوّر کرتے ہوں اور دنیاوی حکومت کے دائرہ
اثر سے باہر ہوں یا خود برسر حکومت ہوں یا محض پیشہ دوانیوں سے کامیاب
ہو سکتے ہوں وہ اپنی انسانی مگر مریض فطرت کے ہاتھوں کیا کچھ طوفان برپا
نہ کریں گے۔ اور دنیا کے سر پر کیا کیا بلائیں نہ لائینگے۔ اُس وقت کونسی
طاقت ہوگی جو اُن لوگوں کو حسن اخلاق پر مجبور کرے گی۔ اور دنیا میں
امن قایم رکھے گی۔

کہا جاتا ہے کہ آج کل مہذب ممالک میں بہت سے لوگ مذہب چھوڑ چکے
ہیں اور باوجود اس کے وہ حسن اخلاق کا اعلیٰ نمونہ ہیں لہذا معاشرت کو ترک
مذہب سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ مگر اول تو دیگر کمزور سیاہ فام اقوام کے
ساتھ اُن کا برتاؤ بہت کچھ اُن کے اخلاقی حسن و خوبی پر روشنی ڈالتا ہے۔ اور
ثابت کرتا ہے کہ اُن کا نیک برتاؤ محض اُنھیں کے ساتھ ہے جو برابر کے طاقتور

اور کلہ بکلہ جواب دینے کی طاقت رکھتے ہیں۔ دوسری پتہ کی بات یہ ہے کہ مذہب کا ہزار ہا سال کا طولانی اثر چند صدیوں میں زائل نہیں ہو سکتا چہ جائے کہ چند نسلوں کی مادی تعلیم اُس اثر کو بالکل فنا کر دے۔ مذہب کی بدولت یہ خیال اب تک تمام دنیا کی فضا میں پھیلا ہوا ہے کہ برائی کا اثر روح کو تاریک کرنے والا اور اب و آئندہ ہزار ہا جسمانی اور روحانی نقصان پہونچانے والا ہے۔ اور کوئی ایسا قانون کا بنانے والا ہے جو عالم کے ذرہ ذرہ پر حکومت کرتا ہے اور اُس کی نظر کبھی اور کسی وقت خطا نہیں کرتی اسی خیال کی کشش ہے جو ابتک عقلا اور جہلا کے دلوں کو پورے طور پر حسی فائدہ کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیتی۔ پس مذہب کے بغیر اخلاقی ترقی کی نظیر اُسی وقت پیش ہو سکے گی جب یہ مادی تعلیم اور خدا کا انکار بھی مذہب کی عمر کے برابر طول کھینچے۔ اور تمام زن و مرد کے قلوب پر مذہب کی طرح دہریت قابض ہو جائے۔ اُس وقت کے لوگ البتہ اخلاق کا نمونہ بن سکیں گے۔

مہاتما گاندھی جی اور پنڈت مالویہ جی اور اُن کے ہم خیال لیڈ چھوت اچھوت اور ذات پات کی قیود توڑنے اور مٹانے کی کوشش میں مدت ہائے دراز سے ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگا رہے ہیں۔ اور یہ کوششیں کچھ اسی صدی میں شروع نہیں ہوئیں بلکہ روشن خیال ہندو بہت پہلے سے ان اصلاحی کوششوں میں سرگرم رہتے چلے آئے ہیں۔ مگر اس مجوزہ

اصلاح کا خود مصلحین کے قلوب پر جتنا اثر ہوا اس کی گہرائی کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ پنڈت مالویہ جی نے چونکہ سمندر پار انگلستان کا سفر کیا تھا تو واپسی پر خطا شوئی کی غرض سے آپ کو پرائشچت (یعنی مروجہ کفارہ ادا) کرنا پڑا۔ آپ اب بھی نیچ قوم کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا نہیں کھا سکتے معاشرتی رسوم کے اعتبار سے ذات پات کے قیود قریب قریب اسی منزل میں ہیں جس میں پہلے تھے۔ اور ان قیود کی شکست کے جو خال خال نظیریں ہیں وہ الشاذ کالمعدوم کے مصداق ہیں۔ خلاصہ یہ کہ صدیوں کے دلنشین عقاید صدیوں ہی میں مٹ سکتے ہیں۔

اگر خدانخواستہ حقیقت میں ایسا زمانہ آئے کہ تمام عالم خدا کا منکر ہو تو وہ وقت نہایت منحوس ہوگا۔ اور یہ انسانی مخلوق اُس وقت بھی انسان ہی رہی اور فرشتہ نہ بن گئی تو نہ ملکی حکومت اور قانون کی پیش جائے گی۔ اور نہ اس کھوکھلی اخلاقی تعلیم کے بنائے کچھ بنے گا جو لوگ فائدہ حاصل کر سکتے ہوں گے وہ وہ قیامت برپا کریں گے کہ عالم تہ و بالا ہو جائے گا عصمت، عفت اور پاکدامنی بے معنی الفاظ رہ جائیں گے۔ مرد کو بیوی اور بیٹی میں تمیز کرنے کی پابندی[1] باقی نہ رہیگی

---

[1] ازدواجی تعلقات کی پابندیاں مذہب کی مقرر کی ہوئی ہیں۔ کسی فطرت کے تقاضہ سے نہیں۔ نہ فطرت میں ایسی پابندیوں کا وجود پایا جاتا ہے۔ ایک شخص اپنے باغ کے درخت میں قلم لگاتا ہے وہ درخت شیریں پھل لاتا ہے۔ مالک کو اپنے درخت کا پھل کھانے سے عقل مانع نہیں ہوتی

مگر یقین ہو کہ ایسا دن کبھی نہ آئے گا اور جب تک مذہب انسانی فطرت کا جزو ہو ان مٹھی بھر چند مادہ پرستوں کی کوشش مذہب کو نابود کرنے میں کامیاب نہ ہوگی کیونکہ فطرت کو بدلنا انسانی طاقت کے دائرہ سے باہر ہو۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝

(ترجمہ۔ ای ہمارے پروردگار ہم کو راہِ راست پر لائے پیچھے ہمارے دلوں کو ڈانواں ڈول نہ کر اور اپنی سرکار سے ہم کو رحمت کا خلعت عطا فرما کچھ شک نہیں تو بڑا دینے والا ہی)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۶)

بھر بہی ٹے سے متمتع ہونے میں عقل کس دلیل سے باپ کو مانع آئے گی۔ ماؤں بہنوں بیٹیوں سے ازدواجی تعلقات پیدا کرنے کے خلاف مذہب ہی تو پابندیاں عائد کرتا ہی۔ جب مذہب ہی نہ رہے گا تو پھر یہ پابندیاں بھی نہ رہیں گی۔ (مولف)

آٹھواں باب

عرضِ مدعا

جو مسلمان نوجوان اسکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں زیرِ تعلیم ہیں یا اپنی تعلیم حال میں ختم کر چکے ہیں اور ہنوز مطالعہ کے عادی ہیں اُن کی خدمت میں التماس ہے کہ اس کتاب کو اول سے آخر تک پڑھ جائیے۔ اُس میں آپ کسی ایسے مسئلے یا اصول یا نظریہ کا ذکر نہ پائیں گے جو بطور رائے یا قیاس یا عقیدہ کے بلا دلیل زبردستی تسلیم کرنا یا ماننا پڑے بلکہ صرف ایسے مسلّمہ اور مستند تاریخی واقعات مذکور ہیں جن سے کسی کو انکار نہیں اور جن کی آج تک کسی نے تردید نہیں کی آپ نے رسول اللہ صلعم کے مختصر حالات ملاحظہ کیے۔ چالیس برس کی عمر تک دوست دشمن آپ کو بالاتفاق سچا اور راست باز تسلیم کرتے ہیں اور آپ کی دیانت اور امانت کے اعتراف کے طور پر آپ کی قوم بالاتفاق آپ کو اَلْاَمِیْن کا خطاب دیتی ہے۔ چالیس برس کی عمر میں نزول وحی کے بعد آپ اسلام کی تبلیغ شروع کرتے ہیں۔ سب سے پہلے آپ کی بیوی۔ اور آپ کے عزیز و اقارب اور آپ کے احباب آپ کی رسالت کی تصدیق کرتے ہیں اور آپ کا دین قبول کرتے ہیں اور آپ کے یہ دوست احباب کوئی معمولی

طبقہ کے لوگ نہیں ہیں بلکہ اس دل و دماغ کے لوگ ہیں جنھوں نے آگے چل کر اپنے اپنے وقت میں بڑے بڑے ملک فتح کیئے۔ دور دراز ملکوں کا نہایت عمدہ انتظام کیا۔ سپہ سالاریاں کیں! ویسی حکومت کی۔ ایسا عدل و انصاف کیا جس کو دنیا کی غیر قومیں آج بھی حیرت انگیز اور بہترین نمونہ قرار دیتی ہیں ان واقعات پر غور کرکے انصاف سے فیصلہ کیجیئے کہ کیا ریاکاری مکر و فریب شعبدہ بازی اور عیاری کو ایسی مستقل اور دیرپا کامیابی اور سربزی نصیب ہو سکتی ہے؟

اس سچے متدین راست باز اور سب سے زیادہ کامیاب رسولؐ کی معرفت دُنیا کی اصلاح اور ہدایت کے لیئے جو پیغام الٰہی پہونچا اُس کی خصوصیات آپ نے ملاحظہ کیں۔ تاریخ اس کی شاہد ہے کہ اس کلام کی فصاحت و بلاغت کے سامنے عرب کے تمام نامور فصحا اور بلغا نے سر جھکا دیا۔ کسی کی ہمت نہ پڑی کہ ایک چھوٹی سے چھوٹی سورۃ کی مانند بھی اپنا کوئی کلام پیش کر سکیں۔ اس کلام کی تاثیر کا یہ عالم ہے کہ حضرت عمرؓ جیسے تیز و تند مزاج عرب رسول خداؐ کے دشمن آپ کو قتل کرنے کی غرض سے شمشیر بکف گھر سے نکلتے ہیں مگر اپنی بہن کے گھر پہونچکر شدت غیظ و غضب کی حالت میں اس کلام الٰہی کی چند آیات پڑھکر اُن کا پتھر جیسا قلب موم کی طرح پگھل جاتا ہے اور آپ آنحضرت کو قتل کرنے کے ارادہ کے بجائے جاں نثاری کے لیئے خدمت اقدس میں حاضر

ہوتے ہیں۔ اور کیا بلحاظ فتوحات ملکی۔ کیا بلحاظ عدل و انتظام اور کیا بلحاظ ذاتی اخلاق و عادات کے دُنیا میں غیر فانی شہرت حاصل کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسا مشہور اور سچا تاریخی واقعہ ہے جس کو ساری دُنیا جانتی اور مانتی ہے۔ اور دوست دشمن سب کو یہ واقعہ تسلیم ہے۔

قرآن مجید کی پیشین گوئیوں پر آپ نے غور کیا۔ ابھی مسلمانوں کی تعداد بہت قلیل تھی اور ظاہری حالات کے لحاظ سے کسی کو ان چند نفوس کے غلبہ کا وہم و گمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔ اور دوسری طرف اپنی کثرت اور قوت کے بھروسہ پر کفار کو یہ یقین تھا کہ ہم ان مُٹھی بھر مسلمانوں کا بہت جلد خاتمہ کر دیں گے۔ چنانچہ تیرہ چودہ برس تک کُفار مسلمانوں کی مختصر جماعت کو ستاتے اور تکلیفیں دیتے رہے۔ مسلمان یہ سب ایذائیں اور مصائب بے آبروئی اور بے حرمتی برداشت کرتے رہے۔ اُن کی تسلی کے لئے اللہ تعالےٰ نے اپنے رسول کی معرفت بار بار یہ اعلان کیا کہ کوئی دن جاتا ہے کہ خود مسلمان غالب ہوں گے اور تمام عرب قبائل کی مخالفانہ قوتوں کا خاتمہ کر دیں گے۔ چنانچہ آنحضرتؐ کے قلیل زمانہ قیام مدینہ میں قرآن مجید کی یہ سب پیشین گوئیاں پوری ہو گئیں اور آپ کی زندگی میں سارے عرب نے اسلام قبول کر لیا۔ کیا دُنیا کی تاریخ میں کسی مظلوم اور ستم رسیدہ مختصر گروہ کی آئندہ شاندار کامیابیوں اور انتہائی عروج کی ایسی پیشین گوئیوں کی کوئی اور نظیر موجود ہے؟

کلام الٰہی کی تعلیم و ہدایت کا نتیجہ دُنیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔
قرآنی تعلیم کے بے مثل ہونیکا سب سے زیادہ واضح معیار یہ ہے کہ جو کام اس کتاب نے کرکے دکھایا وہ آج تک کسی دوسری کتاب نے نہیں دکھایا اور قرآن کریم نے جو انقلاب دُنیا میں پیدا کیا اور جس طرح نہایت پستی کی حالت سے ایک قوم کو اُٹھا کر چند سال کے اندر اوج کمال تک پہونچا یا اُس سے متعلق ساری دُنیا کو اعتراف ہے کہ ایسا عظیم الشان انقلاب کسی اور کتاب نے پیدا کرکے نہیں دکھایا۔ چنانچہ مسٹر سیل قرآن مجید کے اپنے انگریزی ترجمہ کے دیباچہ میں شہادت دیتے ہیں کہ

دُنیا میں اس دین کو جو قبولیت حاصل ہوئی اُس کی کوئی مثال اور نظیر نہیں ہے۔ اور اس دین کو نہ صرف اُن قوموں نے قبول کیا جن پر مسلمانوں نے کبھی فوج کشی نہ کی تھی بلکہ اُن لوگوں (یعنی ترکوں اور تاتاریوں) نے بھی قبول کر لیا جنھوں نے اہل عرب کو اُن کی فتوحات سے محروم اور اُن کی سلطنت بلکہ اُن کے خلیفوں کا خاتمہ کر دیا اور جس میں کوئی بات اُس سے بڑھ کر تھی جو ایک مذہب میں عموماً خیال کی جاتی ہے اور جس کی وجہ سے اُس نے ایسی عجیب ترقی کی"

یہ کشش اور یہ عالمگیر تاثیر جس نے فاتحین کو مفتوح اور مغلوب کیا اگر حق و

صداقت کا نتیجہ نہ تھی تو آخر اس دین کی اشاعت کا اور کیا سبب قرار دیا جا سکتا ہے۔

ڈینٹی نے جو اٹلی کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ مشہور شاعر ہے ایک دلکش اور لطیف نظم لکھی ہے جس کے دو مصرعوں کا مضمون یہ ہے کہ "موسم زمستان میں جبکہ زمہریر کی گرفت سے کوئی چیز آزاد نہ تھی میں مدتوں ایک سوکھی سی شاخ پر ایک کانٹے کو دیکھتا رہا لیکن جب جاڑے گئے اور موسم بہار آیا تو اس کانٹے کے سرے پر ایک خوش رنگ پھول نکل آیا جس کی خوشبو نے میرے دل و دماغ کو معطر کر دیا"

حضرت رسول خداؐ کے ظہور نے اس دلآویز تشبیہ کو مجاز سے حقیقت میں بدل دیا۔ ۵۷۰ء سے پیشتر دنیا خارزار بنی ہوئی تھی مگر اس کبھی نہ فراموش ہونے والی تاریخ کے بعد جبکہ حضور رحمۃ للعلمین کا ظہور ہوا تو وہ یک بیک لالہ زار ہو گئی۔

ان سب واقعات کا علم ہو جانے کے بعد اگر آپ کا دل گواہی دیتا ہے۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ قلب ایسی گواہی نہ دے کہ قرآن مجید پیغام الٰہی ہے تو اس پیغام کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف سے واقف ہونا ہر اس شخص کا پہلا فرض ہے جو اپنے آپ کو مسلمان کہے۔

عالم تنہائی میں جب کہ چاروں طرف سکوت کا عالم ہو اور آپ کی توجہ کو

منتشر کرنے والے اسباب مفقود ہوں اس وقت تھوڑی دیر کے لیے قرآن مجید کو غور سے مطالعہ کیجیے۔ اس کے مطالب پر آگاہ ہو جیے۔ آپ کو اس مطالعہ میں غیر معمولی لذت محسوس ہوگی اور آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ صداقت افسانہ سے کہیں زیادہ دلچسپ ہوتی ہے۔ ساتھ ہی آپ اپنی روزمرہ کی زندگی میں اور پیش آمدہ مشکلات میں اس کلام الٰہی کو اپنا سب سے زیادہ شفیق اور مخلص رہنما پائیں گے۔

میرے ایک ملنے والے انگریزی زبان سے بالکل ناواقف تھے کمشنر نے اُن کو سارٹیفکٹ دیا جس میں ایک جملہ یہ بھی تھا "ہی ہیز ڈن گڈ وار ورک He has done good war work یعنی اس شخص نے "یورپ کی جنگ عظیم کے سلسلہ میں اچھا کام کیا ہے"۔ ان صاحب کو انگریزی الفاظ کے اُردو ترجمہ سے کچھ لطف نہ آتا تھا لہٰذا اُنھوں نے اصل انگریزی الفاظ حفظ یاد کر لیے تھے اور اُن کو جھوم جھوم کر اپنے احباب کے سامنے دُہرایا کرتے تھے۔

اسی طرح دہلی کے ایک صاحب کو وہاں کے چیف کمشنر نے سند دی تھی جس میں لکھا تھا "ہی از دی موسٹ لائل سٹیزن آف دہلی" He is the most loyal citizen of Delhi (یعنی یہ شخص دہلی کا سب سے زیادہ وفادار باشندہ ہے) یہ صاحب بھی انگریزی سے ناآشنا تھے مگر یہ جملہ جو اُنھوں نے حفظ کر لیا تھا اپنے احباب کے سامنے لطف

لے لیکر بیان فرمایا کرتے تھے۔

بغیر سمجھنے کے شاہی زبان کے قلب پر خاص اثر ڈالنے کی یہ چشمدید مفید مطلب مثالیں ہیں۔ جب شاہی زبان میں یہ دلکشی اور دل فریبی ہے تو بشرطیکہ دل کو تھوڑا سا لگاؤ ہو کلام الہٰی کی تاثیر میں کیا کلام ہو سکتا ہے۔ کلام مجید کی عبارت فصیح بھی ہے اور بلیغ بھی۔ فصاحت سے مراد کلام کا ایسے الفاظ سے ترکیب پانا مراد ہے جو زبان پر تلفظ کے وقت سہل ہوں اور کانوں کو خوش گوار ہوں۔ اور دل میں فوراً اثر پیدا کریں۔ بلاغت سے مطلب ہے تھوڑے سے تھوڑے الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مطلب ادا ہونا۔ جب کلام حد سے زیادہ بلیغ ہوگا اور حشو و زوائد سے بالکل پاک ہوگا تو جملوں کے باہم ربط کو سمجھنے کے لئے فہم رسا اور نظر دقیق کی ضرورت ہوگی۔ جو لوگ بلیغ کلام کے سمجھنے کے خوگر ہوتے ہیں وہ کلام کی خوبیوں کو بہ آسانی سمجھ لیتے ہیں اور اس کا لطف اٹھاتے ہیں۔ مثلاً غالب کے اشعار یا دیوان حافظ کی غزل یا مثنوی مولانا روم کا کوئی ٹکڑہ یا سہ نثر ظہوری کی عبارت سن کر اہل ذوق فوراً لطف اندوز ہوتے ہیں مگر عوام کے لیئے اُن کتابوں کی متعدد شرحیں شایع ہو چکی ہیں اور ہوتی رہتی ہیں۔ یہی کیفیت قرآن مجید کی عبارت کی ہے۔ اپنی بد مزاقی کی وجہ سے بعض نکتہ چینوں کا خیال ہے کہ کلام الہٰی کے مضامین اور عبارت میں کوئی ترتیب اور ربط نہیں ہے۔ یہ خیال

ناواقفیت پر مبنی ہی۔ ساری دُنیا میں ابتدا سے لیکر آج تک ایک ہی ترتیب کا رواج اس کا شاہد ہی کہ سورتوں اور آیتوں کی موجودہ ترتیب سراسر آنحضرت کی ہدایت کے مطابق ہی۔ چونکہ آنحضرتؐ کی وفات کے وقت بہت سے حفاظ موجود تھے جن کو یقیناً تمام قرآن مجید بالترتیب یاد تھا اور جس کی وہ نمازمیں اور نماز کے علاوہ ترتیب مقررہ کے ساتھ تلاوت فرماتے تھے اور جن کی مدد سے حضرت ابوبکرؓ نے اُسی ترتیب سے پہلی بار اُس کو لکھوایا اور جس کے مطابق حضرت عثمانؓ نے اُس کی نقلیں ممالک مفتوحہ میں تقسیم کرائیں اور جو ترتیب بلا اختلاف تمام دُنیاء اسلام میں مستند سمجھی جاتی ہی اس ترتیب کے صحیح ہونے میں شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہی۔

آیات و سورتوں کے نزول کی ترتیب دوسری ہوتا بالکل غیر متعلق مسئلہ ہی اس کی مثال بالکل ایسی ہی جیسے ہمارے ملکی قانون کی ہی۔ ملکی قانون میں حسب اقتضاء ضرورت جو اضافے (یا ترمیمات) وقتاً فوقتاً ہوتے رہتے ہیں وہ بہ اوقات مختلف گورنمنٹ پریس میں چھپ کر کاغذ کے تراشوں کی صورت میں تقسیم ہوجاتے ہیں اور جن جن لوگوں کے پاس وہ قانون کی کتاب ہوتی ہی وہ مطبوعہ ہدایات کے مطابق اُن اضافوں اور ترمیموں کے مطبوعہ تراشوں کو اپنی اپنی جگہ مناسب موقعہ پر اُس کتاب میں چسپاں کرلیتے ہیں ان اضافوں اور ترمیموں کی طباعت اور اشاعت کی تاریخ کا اصل

قانون کی کتاب کی ترتیب پر کوئی اثر نہیں تا تمام کلام مجید آنحضرتؐ کے زمانہ میں نازل ہو چکا تھا۔ پھر یہ بات کسی طرح عقل گوارا نہیں کرتی کہ اس قدر طویل مضامین کی کوئی ترتیب آنحضرتؐ نے قایم نہ فرمائی ہو اور آنحضرت صلعم خود اور اس وقت کے تمام حفاظ قرآن مجید کی تلاوت بغیر کسی ترتیب کے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق کیا کرتے ہوں اگر ایسا ہوتا تو قرآن مجید کی پہلی ترتیب کے وقت حفاظ میں نیز دیگر مسلمانوں میں باہم سخت اختلاف نمودار ہوتا اور جھگڑا ہوتا۔ مگر ایسا نہیں ہوا بعض علمانے تو آیات اور سورتوں کی موجودہ ترتیب کو بھی بجائے خود قرآن مجید کے اعجاز کی ایک وجہ قرار دی ہے۔ چنانچہ جب آیات کا باہم ربط بتلانے سے معلوم ہو جاتا ہے تو حیرت ہوتی ہے کہ ایسی آسان بات پہلے بغیر بتلائے خود بخود کیوں سمجھ میں نہ آئی۔ مثلاً ایک بزرگ ماہر قرآن کریم کی صحبت میں سورہ وَالعٰدِیٰت کا ترجمہ پڑھنے کا اتفاق ہوا۔

وَالْعٰدِیٰتِ ضَبْحًا ۝ فَالْمُوْرِیٰتِ قَدْحًا ۝ فَالْمُغِیْرٰتِ صُبْحًا ۝ فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ۝

(ترجمہ) (غازیوں کے) ان گھوڑوں کی قسم جو دوڑتے دوڑتے ہانپ اٹھتے ہیں پھر (پتھروں پر اپنی ٹاپوں) کے مارنے سے چنگاریاں نکالتے ہیں

پھر صبح کے وقت (دشمنوں پر) چھاپا مارتے ہیں۔ پھر اس وقت (اپنی
دوڑ دھوپ سے) غبار بلند کرتے ہیں۔ پھر اسی وقت (دشمنوں کی) جماعت
میں جاگھستے ہیں۔ بے شک انسان اپنے پروردگار کا بڑا ہی ناشکر ہے۔
ہم جب چیز کی قسم کھاتے ہیں اس کو اپنا گواہ قرار دیتے ہیں۔ مثلاً خدا کی قسم
ایسا ہوا یعنی خدا گواہ ہے ایسا ہوا۔ اسی طرح قرآن شریف میں وارد ہوا ہے
وَالْعَصْرِ یا وَالْعٰدِیٰتِ یعنی زمانہ کی قسم (زمانہ اس کا شاہد ہے) یا گھوڑے
کی قسم (گھوڑا اس بات کا گواہ ہے) ملک عرب میں گھوڑے کو جو فضیلت حاصل
ہے اور عربوں کو اپنے گھوڑوں سے جو غیر معمولی تعلق ہوتا ہے اس اہمیت کے
لحاظ سے گھوڑے کو گواہ قرار دیا گیا کہ گھوڑوں کی قسم انسان اپنے پروردگار کا
بڑا ہی ناشکرا ہے۔ چونکہ گھوڑے اور انسان کے ناشکرے پن میں بظاہر کوئی تعلق
معلوم نہیں ہوتا اس لیے دریافت کیا گیا حضرت مولانا صاحب صرف اتنا کہنے
پائے تھے کہ جن گھوڑوں سے جنگ میں یہ خدمات لی جاتی ہیں یہاں تک
کہ آخر میں وہ جان دے دیتے ہیں اُن کو چند مٹھی گھاس کے تنکے اور
تھوڑا سا چنے کا دانہ آپ دیتے ہیں۔ بس اتنا سن کر سب مطلب سمجھ میں
آگیا۔ اور تعجب تھا کہ اتنی موٹی بات خود ہماری سمجھ میں کیوں نہ آئی۔
خلاصہ یہ ہوا کہ جن گھوڑوں کو آپ چند تنکے گھاس کے اور تھوڑا سا
دانہ کھلا کر اُن سے ایسی ایسی جانکاہ خدمتیں لیتے ہیں۔ تو انسان کو جو نعمتیں

عطا ہوئی ہیں۔ اُن کے بدلے آپ اپنے آقا کے کیا کیا خدمات بجالاتے ہیں۔
چونکہ کلام الٰہی نہایت بلیغ ہے اس لیئے عام مسلمانوں کے سمجھنے کے لیئے
تھوڑی بہت تشریح لازمی ہے۔ خصوصًا ہندوستانی مسلمانوں کو ایسے اُردو
ترجمہ کی ضرورت ہے جس میں زمانہ حال کی جدید تحقیقات کا لحاظ رکھتے ہوئے
ایسے فٹ نوٹ ہوں جن میں نہایت تحقیق اور تفتیش کے بعد جغرافیائی
اور تاریخی حوالوں کی مناسب وضاحت ہو۔ اور مروجہ مختصر تفسیری حاشیوں
کے علاوہ سورتوں کے شروع میں ترتیب آیات کا لحاظ رکھتے ہوئے مضامین
کا خلاصہ درج ہو۔ اور سورتوں کا باہم ربط نیز جہاں جہاں ضرورت سمجھی جائے
وہاں آیات کا باہم ربط اور تعلق ظاہر کردیا جائے۔ ضخامت جہاں تک ممکن
ہو کم سے کم ہو تاکہ معمولی حیثیت کے مسلمان اُس کا ہدیہ ادا کرنے کے
متحمل ہوسکیں۔ حلّ لغات۔ فلسفیانہ مباحث۔ مفسرین کی رائیں اور
اعتراضات اُٹھا کر اُن کے جواب لکھنے کی کوشش۔ نیز ایسی تفصیلات کی ضرورت
نہیں جن کا اصل متن سمجھانے سے گہرا تعلق نہ ہو۔ ایسا ترجمہ میسّر ہونے سے
اسکولوں اور کالجوں کے لیئے دینی نصاب کا مسئلہ خود بخود حل ہوجائے گا
بشرطیکہ قرآن مجید پڑھانے والے اتنے تعلیم یافتہ تو ہوں جتنے ریاضی۔ تاریخ
جغرافیہ۔ فلسفہ اور اقتصادیات وغیرہ مضامین پڑھانے والے ہوتے ہیں
میں نے مولوی محمد علی صاحب ایم۔ اے (لاہور) کا اردو ترجمہ قرآن مجید دیکھا ہے اور

مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کا ترجمہ بیان القرآن بھی مطالعہ کیا ہے ان دونوں ترجموں میں اختصار کی بہت گنجائش ہے۔
ہم سب واقف ہیں کہ مطبوعہ بائبل کے نسخوں میں کوئی تفسیر نہیں ہوتی حالانکہ یورپ میں عیسائی محققین اور علما کی کمی نہیں ہے بلکہ اُن کی تعداد بہت زیادہ ہے اور اُن کی تحقیقات علمی کا پایہ بھی بلند ہے۔ مگر چونکہ عیسائیوں کو بائبل پڑھانے والے اپنے مضمون کے ماہر ہوتے ہیں۔ اور اپنے مضمون سے شغف بھی رکھتے ہیں اس لیئے وہاں تفسیر غیر ضروری سمجھی جاتی ہے۔ ہمارے مفسرین بلحاظ رواج کے یہ جانتے ہیں کہ قرآن مجید کسی درسگاہ میں درسًا درسًا اُستاد نہیں پڑھاتے۔ بڑے مدرسوں میں تفسیریں اور تفسیروں کی تفسیریں البتہ پڑھائی جاتی ہیں اس لیئے ترجموں اور تفسیروں میں طوالت ناگزیر ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ عام مسلمان جو عمومًا معرّٰے قرآن مجید یا مروّجہ مترجم نسخے خریدتے ہیں وہ ایک طرف مفصل تفسیروں کے فیض سے محروم رہتے ہیں اور دوسری طرف مروجہ ترجمے تفہیم مضامین میں کافی مدد نہیں دیتے۔ اور جن غیر مطلب تفسیری ترجموں کا مجھے علم ہے اُن کا حجم زیادہ ہے۔
قرآن مجید کا ترجمہ غور اور توجہ کے ساتھ مطالعہ کرنے اور سمجھنے سے طلبا پر یہ راز خود منکشف ہونے لگے گا کہ اس کتاب اللہ میں وہ کون کون سی ہدایتیں ہیں جن پر عمل کرنے سے جاہل عربوں نے بہت تھوڑے عرصہ میں دنیا کو

فتح کرلیا۔ اور یہ بھی معلوم ہوگا کہ اب کیوں مسلمانوں کو اس کتاب کے مطالعہ سے پہلے کی طرح نفع نہیں ہوتا۔ یہ حجت صحیح نہیں ہے کہ اب حالات بدل گئے ہیں۔ اور پرانے ہتھیار اس زمانہ کے نئے آلات کا مقابلہ نہیں کرسکتے جس وقت عرب میں بدو ساربانوں کی قوم جاگی ہے تو عرب کی سرحدوں سے ملحق رومۃ الکبریٰ اور فارس کی نہایت شائستہ اور مہذب سلطنتیں قائم تھیں ان شائستہ قوموں کے ذہن میں اہل عرب کی جو وقعت تھی وہ یزد جرد شہنشاہ فارس کے اس قول سے ظاہر ہوتی ہے ؎

زشیرِ شتر خوردن و سوسمار عرب را بجائے رسیدست کار
کہ تختِ کیاں را کنند آرزو تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

مگر انھیں جاہل اور اونٹ چرانے والے بدوؤں نے اسی قرآن مجید کے زیر ہدایت جو کام کیئے دُنیا اُن سے واقف ہے۔ کیا تعجب کی بات نہیں کہ اسی ملک ہندوستان کے رہنے والے اسی زمانہ میں ہماری ہمسایہ قوم (ہندو صاحبان) کے بڑے بڑے سربرآوردہ لیڈر گیتا کے ذریعہ سے جو تصوف کا ایک رسالہ ہے اور مہابھارت اور رامائن کے افسانوں کے ذریعہ سے اپنی قوم میں ترقی کی روح پھونکنے کی کوششیں کر رہے ہیں اور اُن کے حوالوں سے قومی ترقی کے ولولوں کو برانگیختہ کر رہے ہیں۔ اُن کے مقابلہ میں مسلمان اپنے آپ کو اس عجیب و غریب کتاب سے بے نیاز سمجھ بیٹھے ہیں جس کا کچھ حال صفحات

اسبق میں مذکور ہوا ہے۔
قرآن مجید اعلان کرتا ہے وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ ۝
(یعنی قرآن کو ہم نے مومنوں کے لئے شفا اور رحمت کر کے بھیجا ہے)
کیا کوئی مسلمان اس صداقت سے انکار کر سکتا ہے۔ کیا یہ وعدہ صرف پرانے زمانہ کے مسلمانوں سے مخصوص تھا۔ اور اب یہ آیت معطل ہو گئی ہے۔ ہمارا مریض ہونا مسلّم۔ اور قرآن مجید شفا ہونے کا مدّعی۔ لہذا یہ مسئلہ حل طلب ہے کہ ایسے مجرّب نسخے سے مرض کا ازالہ کیوں نہیں ہوتا۔ اطبّاء قدیم کی تحقیقات سے اطبائے حال برابر فائدہ اٹھا رہے ہیں اور پرانی جڑی بوٹیوں کو نئے طریقوں سے زود اثر بنا کر دنیا کو فائدہ پہونچا رہے ہیں۔ نظر بہ حالات کیا اس امر کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ قرآن مجید کو سمجھنے کی کوشش کی جائے اور درِ مقصود کی تلاش میں اس بحرِ ذخّار میں غوطہ لگایا جائے۔
حضرت شاہ اسمعیل صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب تقویۃ الایمان کے صفحہ ۳ پر لکھتے ہیں کہ
”اس زمانہ میں دین کے معاملہ میں لوگ کتنی راہیں چلتے ہیں کوئی پہلوں کی رسموں کو پکڑتے ہیں۔ کوئی بزرگوں کے قصے دیکھتے ہیں اور کوئی عالموں کی باتوں کو جو انھوں نے اپنے ذہن کی تیزی سے

نکالی ہیں سند پکڑتے ہیں۔ اور عوام الناس میں یہ بات مشہور ہو کہ
اللہ رسول کا کلام سمجھنا بہت مشکل ہو۔ اُس کے سمجھنے کو بڑا علم چاہیے
ہم کو وہ طاقت کہاں کہ اُن کا کلام سمجھیں اور اُس راہ پر چلنا بڑے
بزرگوں کا کام ہو۔ سو ہماری کیا طاقت ہو کہ اُس کے موافق چلیں بلکہ
ہم کو یہی باتیں کفایت کرتی ہیں۔ سو یہ بات بالکل غلط ہو۔ اس واسطے
کہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہو کہ قرآن مجید میں باتیں بہت صاف اور صریح
ہیں اُن کا سمجھنا مشکل نہیں اور اللہ اور رسول کے کلام سمجھنے کو بہت
علم نہیں چاہیئے کیونکہ پیغمبر تو نادانوں کو راہ بتانے کو اور جاہلوں کو
سمجھانے اور بے علموں کو علم سکھانے کو آئے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ نے

سورۂ جمعہ (رکوع ۱) میں ارشاد فرماتا ہی۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝ (یعنی وہ خدا
ہی تو ہی جس نے اَن پڑھوں میں اُنھیں میں سے پیغمبر بنا کر بھیجا۔ وہ
ان کو خدا کی آیتیں پڑھکر سناتا ہی اور اُن کو پاک کرتا ہی اور اُن کو
کتاب اور حکمت سکھاتا ہی ورنہ اُس سے پہلے تو یہ لوگ صریح گمراہی میں
مبتلا تھے)

سو جو کوئی یہ آیت سُن کر پھر کہنے لگے کہ پیغمبر کی بات سوائے عالموں کے کوئی سمجھ نہیں سکتا اور اُن کی راہ پر سوائے بزرگوں کے کوئی نہیں چل سکتا تو اُس نے اس آیت کا انکار کیا۔ اس بات کی مثال یہ ہے کہ جیسے ایک بہت بڑا حکیم ہو اور ایک بہت بیمار۔ پھر کوئی شخص اُس بیمار سے کہے کہ فلانے حکیم کے پاس جا کر اُس کا علاج کراؤ اور وہ بیمار کہے کہ اُس حکیم سے علاج کرانا تو بڑے بڑے تندرستوں کا کام ہے مجھ سے یہ کیونکر ہو سکتا ہے کیونکہ میں تو سخت بیمار رہوں۔ سو وہ بیمار نادان ہے اور اُس حکیم کی حکمت کا انکار کرتا ہے۔ اس واسطے کہ حکیم تو بیماروں ہی کے علاج کے واسطے ہے۔ جو تندرستوں کا علاج کرے اور انھیں کو اُس کی دوا سے فائدہ ہو اور بیماروں کو کچھ فائدہ نہ ہو تو وہ حکیم ہی کاہے کا ہے؟"

حضرت شاہ صاحبؒ کے ارشاد کا خلاصہ یہ ہے کہ اصل قرآن مجید پر غور و فکر کرنا بہت ضروری اور نفع بخش ہے۔ قرآن مجید کا انسانیت پر سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ وہ بنی نوع انسان کے لیے ایسا مکمل ہدایت نامہ پیش کرتا ہے جو بیک وقت انسان کی انتہائی روحانی اور مادی ترقی کا ضامن اور کفیل ہے۔ اور جس نے دین و دُنیا کو لازم ملزوم قرار دیا۔ اور آنحضرتؐ کے وجود کو اپنی تعلیم کا بہترین نمونہ پیش کر کے یہ ثابت کر دیا کہ آدمی **خلافت**

کے بغیر عبدیت میں کامل نہیں ہوسکتا۔

اسی تعلیم نے وحشی عربوں میں بہت جلد ایسے اوصاف اور اخلاق پیدا کر دیئے کہ ایک طرف تو وہ سب سے زیادہ موحد اور خدا پرست بن گئے اور دوسری طرف چند سال کے عرصہ میں دُنیا کی بڑی بڑی زبردست سلطنتوں نے اُن کے سامنے سر اطاعت خم کر دیا۔

تاریخ عالم شاہد ہے کہ ہر قوم کی اخلاقی اور مادی حالت کی ترقی اور تنزل کا ہمیشہ ساتھ رہا ہے۔ جیسی قوم کی مادی حالت ہوتی ہے ویسے ہی اُس کے اخلاق ہوتے ہیں۔ اگر قوم زندہ ہوتی ہے تو اُس کے افراد میں جُرأت ہمت۔ استقلال۔ ترقی کی اُمنگ۔ قربانی کا ولولہ اور حوصلہ ہوتا ہے۔ اور جب قوم مُردہ ہوتی ہے تو اُس کے افراد پست ہمت سُست۔ بُزدل۔ ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھنے والے ہوتے ہیں۔ نواب محسن الملک مرحوم نے ایک موقعہ پر اس تنزل کو ایک مثال سے واضح کیا تھا کہ جب مسلمانوں میں کچھ جان تھی تو اُن میں وعدہ اور قول و قرار کا دوسرا مفہوم تھا۔ اور جب اُن پر مردنی چھا گئی تو انھیں الفاظ کا دوسرا مفہوم ہوگیا یعنی پہلے مشہور تھا "قول مرداں جاں دارد" پھر یہ حالت ہوگئی "وعدہ آسان ہے وعدہ کی وفا مشکل ہے" اب اس کے بعد رفتہ رفتہ حالت اس حد کو پہونچ گئی ہے کہ "وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہوگیا"

اسی طرح قرآن مجید کی اصطلاحوں نے بھی ہماری پستی کے لحاظ سے

نئے نئے معنی پہن لیے ہیں مثلاً اسلام کی تعلیم "توکل" کو غیر قوموں نے نہایت عزت و احترام کی نظروں سے دیکھا تھا۔ قرآن مجید کی سورہ مائدہ کے رکوع ۴ میں ارشاد ہوتا ہے قَالُوا يٰمُوسٰۤى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ۝ قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَيْهِمُ الْبَابَ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ۔ وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْۤا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (یعنی وہ لوگ کہنے لگے کہ اے موسیٰ اس ملک میں تو بڑے زبردست لوگ رہتے ہیں۔ اور جب تک وہ وہاں سے نہ نکل جائیں ہم تو اس ملک میں قدم رکھتے نہیں۔ ہاں وہ لوگ اس میں سے نکل جائیں تو ہم ضرور جا داخل ہوں گے خدا کا ڈر ماننے والوں میں سے دو آدمی تھے کہ اُن پر خدا نے اپنی خاص مہربانی کی وہ بول اُٹھے کہ اُن پر چڑھائی کر کے دروازے میں گھس پڑو اور جب تم دروازہ میں گھس پڑے تو بلاشبہ تمہاری فتح ہے۔ اور تم ایمان رکھتے ہو تو اللہ پر توکل کرو)

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ توکل سے مطلب ہے مشکلات کی حالت میں پوری ہمت سے کام لینا اور نتیجہ کی طرف سے خائف ہو کر کام نہ چھوڑنا بلکہ نتیجہ کے متعلق خدا تعالیٰ سے کامیابی کا بھروسہ رکھنا۔

لیکن اب ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ جانے اور کچھ کام نہ کرنے کو توکل کہنے لگے

چنانچہ ایسے ایسے قصے مشہور ہیں کہ ایک صاحب نے توکل کیا۔ اور ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ رہے اور عہد کیا کہ میں اس وقت تک کھانا نہ کھاؤں گا جب تک خود بخود کھانا غیب سے میرے منہ میں نہ آ جائے گا۔ اسی طرح کچھ عرصے بیٹھے رہے اس کے بعد کھانے کا ایک خوان اُن کے سامنے آ موجود ہوا۔ وہ سمجھے کہ کام ہو چکا اور اپنے ہاتھ سے کھانا کھانے لگے۔ اتنے میں غیب سے ندا آئی تو جلدی کر گیا اگر کچھ دیر اور استقلال سے کام لیتا تو کھانا خود بخود لقمے بن کر تیرے منہ میں پہونچتا۔ چونکہ قرآن مجید میں توکل کی تعریف ہے اس لیے نکمے لوگ مستحق تعریف قرار پا گئے کہ فلاں صاحب بڑے متوکل ہیں کچھ کام نہیں کرتے کبھی گھر سے باہر بھی نہیں نکلتے۔

اسی طرح "صبر" کے معنے آج کل فقط یہ لیئے جاتے ہیں کہ کوئی مصیبت آ پڑے تو اظہار غم نہ کریں۔ دقتیں برداشت کریں اور چپ چاپ بیٹھے رہیں اُف نہ کریں۔ اس قسم کی بے حمیتی کی تعریف کی جاتی ہے اور سمجھا جاتا ہے کہ یہ قرآنی ہدایت کی تعمیل ہے۔ حالانکہ قرآن مجید میں جس صبر کی تعریف ہے اُس کا مفہوم یہ ہے کہ صحیح اصول پر کام کرنے میں جو دقتیں پیش آئیں اُن کا برداشت کرنا اور کام کو جاری رکھنا اور نباہنا۔ اور مشکلات سے گھبرا کر اپنا کام نہ چھوڑنا۔ چنانچہ سورۂ آلِ عمران کے رکوع ۱۰ میں ارشاد ہوتا ہے

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ

فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَکَانُوْا وَاللّٰہُ یُحِبُّ الصّٰبِرِیْنَ

(یعنی اور بہت سے پیغمبر ہو گزرے ہیں جن کے ساتھ ہو کر بہت سے اللہ والے لوگ دشمنوں سے لڑے تو جو مصیبت اُن کو اللہ کے راستہ میں پہونچی اُس کی وجہ سے نہ تو اُنھوں نے ہمت ہاری اور نہ بودا پن کیا اور نہ دشمنوں کے آگے عاجزی کا اظہار کیا اور اللہ صابروں کو دوست رکھتا ہی)

کلام مجید میں صابروں سے توقع کی جاتی ہی کہ کم سے کم اپنے سے دُگنی قوت پر وہ غالب ہو جائیں گے۔

فَاِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ مِّائَۃٌ صَابِرَۃٌ یَّغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ وَاِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ اَلْفٌ یَّغْلِبُوْا اَلْفَیْنِ بِاِذْنِ اللّٰہِ ۔ وَاللّٰہُ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ۵

(یعنی اگر تم میں سے سو صابر ہوں گے تو وہ دو سو پر غالب رہیں گے۔ اور اگر تم میں سے ایسے ایک ہزار ہوں گے تو وہ خدا کے حکم سے دو ہزار پر غالب رہیں گے اور اللہ تعالیٰ صابروں کے ساتھ ہی۔) سورۂ انفال رکوع ۹

ان مثالوں سے صرف یہ جتلانا مقصود ہی کہ اصل کتاب پیش نظر نہ رہنے سے اور شرحی تفصیلات کی طرف متوجہ ہو جانے سے ایک تو الہامی الفاظ کے غلط مفہوم رائج ہو گئے۔ اور دوسرے کلام مجید کی تعلیم کے ضروری پہلو نظرانداز ہو گئے۔

ہندوستان کے مسلمانوں کی معاشرتی۔ اخلاقی۔ اور سیاسی پستی اب اِس

حد تک پہونچ گئی ہو کہ یہ خیال عام ہو گیا ہو کہ روحانی ترقی اور دُنیاوی ترقی دو متضاد حقیقتیں ہیں۔ چنانچہ مسلمان عموماً اب دو طبقوں میں تقسیم نظر آتے ہیں ایک بزعم خود روحانی اور دوسرا دنیاوی۔ پہلے طبقہ نے اپنا فرض گوشہ نشینی اور ترک دُنیا اور ماحول سے بے خبر رہنا قرار دیا! انکا خیال ہو کہ دُنیاوی عزت ثروت حکومت اور تونگری غیر مسلموں کے لیئے ہو۔ اور محتاجی فقیری اور مسکینی مسلمانوں کا طغرائے امتیاز ہو۔ خلاصہ یہ کہ دنیا مسلمانوں کے لیے نہیں ہو بلکہ کافروں کے لیئے مخصوص ہو۔ اور جنت مسلمانوں کے لیئے ؎

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید ناامیدی اُس کی دیکھا چاہیئے

دنیا بکری ہو اور اُس کے طالب کتّے۔

اہل دنیا کافرانِ مطلق اند۔ روز و شب در زق زق و در بق بق اند

اس کے برعکس دُنیاوی ترقی کی کوشش کرنے والے بدقسمتی سے اپنے آپ کو روحانی ترقی سے بے نیاز سمجھنے لگے۔ طرفین کے یہ خیالات قرآنی تعلیم کے بالکل برخلاف ہیں۔

قرآن مجید میں جگہ جگہ اور بار بار دوہرایا گیا ہو کہ جن لوگوں نے پیغمبروں کو جھٹلایا اور احکام الٰہی کی پیروی نہیں کی اُن کو جہاں دیکھو ذلت اُن کے سر پہ سوار ہو اور وہ خدا کے غضب میں گرفتار ہیں۔ اور محتاجی ہو کہ الگ اُن کے پیچھے پڑی ہوئی ہو

یعنی تباہی اور مسکنت خدا کے غضب کی نشانی قرار دی گئی ہے۔ اس کے برعکس جیسا کہ اس کتاب کے پانچویں باب میں بتلایا گیا ہے اللہ تعالیٰ نے اُن لوگوں سے جو ایمان لائیں گے اور نیک عمل کریں گے اُن کو دُنیا میں غلبہ، حکومت اور سلطنت عطا کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ اور یہ کہ عزت اللہ اور اس کے رسول اور مومنین ہی کے لیئے ہے۔

اگر غور اور توجہ کے ساتھ قرآن مجید کا مطالعہ کیا جائے تو دُنیاوی زندگی کو کامیاب بنانے کے موثر وسائل کی اس میں بہت کچھ تصریح ہے۔ عام طور پر قرآن مجید میں جو قصے بیان ہوئے ہیں اُن کو صرف حکایتوں اور کہانیوں کا درجہ دیا جاتا ہے اور اُن سے حقیقی طور پر مستفید ہونے کا قصد ہی نہیں ہوتا۔ حالانکہ خود قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے کہ قرآنی قصص میں مسلمانوں کے لیئے ہدایت اور نصیحت مقصود ہے۔ مثلاً حضرت یوسفؑ کا قصہ عام طور پر حسن و محبت کا ایک واقعہ سمجھا جاتا ہے حالانکہ قرآن مجید اُس کو احسن القصص قرار دیتا ہے۔ اس قصہ میں علاوہ اور بہت سی خوبیوں کے اپنے جذبات پر قابو رکھنے۔ اپنے آقا کی امانت میں خیانت نہ کرنے اور کسی حالت میں اپنے فرض سے غافل نہ ہونے اور اپنے کام کو نہ چھوڑنے اور اسی قسم کی اُن مخصوص اخلاق کی تعلیم ہے جن سے ایک شخص غلام کی حیثیت سے ترقی کر کے حکومت کے مرتبہ پر پہونچ سکتا ہے۔ حضرت یوسفؑ نے اپنے صحیح اصول کے خلاف کام کرنے کی بجائے قید کی مشقت برداشت کی اور جب آپ

قیدخانہ میں محبوس ہوگئے تو وہیں قیدیوں کو توحید کی تبلیغ شروع کردی۔
اسی طرح مثلاً طالوت اور جالوت کا قصہ ہے اس میں اہم کام انجام دینے کی ہدایتیں شامل ہیں۔ کوئی بڑا کام کرنے کے لیئے افسر (لیڈر) کی ضرورت۔ افسر کی صفات کہ علمی اور جسمانی دونوں قوتیں اُس میں اعلیٰ درجہ کی ہونا ضروری ہیں اور اس بات کی تلقین کہ مالدار ہونا افسری کی کوئی ضروری شرط نہیں۔ ساتھ ہی کام کرنے والوں کی صفات کا ذکر ہے کہ یہ لوگ آزمایش کے بعد منتخب کیئے جائیں۔ پیروؤں میں ڈسپلن کی ضرورت اور یہ کہ کامیابی کے لیئے کثرتِ تعداد لازم نہیں ہے۔ اگر تعداد کم ہو لیکن لوگ ثابت قدم اور مشکلات برداشت کرنے والے ہوں اور جذبات پر قدرت رکھتے ہوں تو کثیر جماعت پر غالب آئیں گے
حضرت موسیٰ کے قصّے کو چند معجزات میں محصور سمجھا جاتا ہے۔ اور زیادہ تر بحث اس پر ہوتی ہے کہ جس وقت حضرت موسیٰؑ نے بحرِ قلزم کو عبور کیا تو معجزہ کی وجہ سے پانی پھٹ کر علحدہ ہوگیا اور خشکی نکل آئی یا معجزہ نہ تھا صرف معمولی جذر و مد تھا۔ ساری توجہ اس قسم کی بحث پر صرف ہوجاتی ہے حالانکہ اس قصہ میں تعلیم ہے اپنی قوم کو انتہائی ذلت اور ظلم سے نکال کر ترقی کے اعلیٰ درجہ پر پہونچانے کی۔ بنی اسرائیل اس قدر ذلیل حالت میں تھے کہ اُن کے حاکم اُن کے بیٹوں کو ذبح کرڈالتے تھے۔ اور اُن کی بیٹیاں اپنی خدمت کے لیئے زندہ رکھتے تھے۔ حضرت موسیٰ کے قصہ کے سلسلے میں اُن تدابیر اور

اوصاف کا ذکر ہو جن کی بدولت بنی اسرائیل کو اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی غور کرنے والوں کے لیے مشتے نمونہ از خروارے یہ چند اشارات کافی ہیں۔

حقیقی ترقی اور کامیابی کے لیے جن اوصاف اور جس ایثار اور قربانی کی ضرورت ہو اُن کا سنگ بنیاد دو اور صرف دو ہی چیزیں ہو سکتی ہیں۔ خود دُنیا کی تاریخ گواہ ہے کہ قومی ترقی میں ہمیشہ صرف ان ہی دو قوتوں سے کام لیا گیا ہے۔ یا تو مذہب یا حب وطن۔

مولانا شبلیؒ نے اس صداقت کو اپنے مخصوص طرز میں نہایت خوبی سے نظم کیا ہے

تم کسی قوم کی تاریخ اُٹھا کر دیکھو — دو ہی باتیں ہیں کہ جن پر ہے ترقی کا مدار
یا کوئی جذبۂ دینی تھا کہ جس نے دم میں — کر دیا ذرّۂ افسردہ کو ہم رنگ شرار
ہے یہ وہ قوّت پر زور کہ جس کی ٹکر — سنگ خارا کو بنا دیتی ہے اک مشت غبار
اِس کی زد کھا کے لرز جاتی ہے بنیاد زمیں — اس سے ٹکرا کے بکھر جاتے ہیں اعراق دیار
یہ اسی کا تھا کرشمہ کہ عرب کے بچے — کھیلنے جاتے تھے ایوان گہ کسریٰ میں شکار
دم اُلٹ دیتے تھے دنیا کا مرقع دم میں — جن کے ہاتھوں میں رہا کرتی تھی اونٹوں کی مہار
اُس کی برکت تھی کہ صحرائے حجازی کی ہوا — بن گئی دہر میں جا کر چمن آرائے بہار
یہ اسی کا تھا کرشمہ کہ عرب کے رہزن — فاش کرنے لگے جبریل امیں کے اسرار
یا کوئی جاذبۂ ملک و وطن تھا جس نے — کر دیئے دم میں قوائے عملی سب بیدار

ہے اسی مے سے یہ مستیٔ احرارِ وطن ہے اسی نشے سے یہ گرمیٔ ہنگامۂ کار

چونکہ حقیقی قومیت کا جزوِ اعظم حکومت اور سلطنت بھی ہے اس لیئے مسلمانوں کے جن کثیر التعداد طبقوں میں حکومت نہیں ہے ان کا جذبۂ قومیت ضعیف ہے اور اُن میں جرمنوں فرانسیسیوں. جاپانیوں اور ترکوں کی طرح جغرافیائی وطن کی محبّت کا جذبہ بھی بہت کمزور ہے نیز "عالمگیر اخوت" کا زریں اسلامی اصول مسلمانوں کے دلی تعلق کو جغرافیائی وطن" تک محدود رکھنے سے مانع ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلعم کی مکّہ سے مدینہ شریف کی طرف ہجرت اور انصار و مہاجرین کی مدد سے صرف مذہب کی خاطر اہل مکّہ (یعنی اہل وطن) سے مسلسل جنگ وجدال حُب وطن کے جذبہ پر مذہبی تحریک کے غلبہ کا ثبوت ہے۔

فاتح اسپین اسلامی جنرل طارقؓ کا مشہور قول کہ "خدا کی تمام سرزمین مسلمانوں کا وطن ہے"، اسی خیال کا موید ہے:۔

طارق چو برکنارۂ اندلس سفینہ سوخت گفتند کارِ تو بہ نگاہِ خرد خطاست

دوریم از سوادِ وطن باز چوں رسیم ترکِ سبب ز روئے شریعت کجا رواست

خندید و دستِ خویش بہ شمشیر برد و گفت ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست

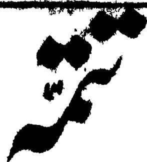
ہندوستان کے مایۂ ناز شاعر ڈاکٹر اقبال کا شہرۂ آفاق قومی ترانہ "مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا"، بھی اسی صداقت کی شرح ہے۔ ان

حالات اور واقعات کے زیر اثر زیادہ تر گزشتہ زمانہ میں ان کے قوائے عمل کو بیدار کرنے اور تحریک میں لانے کا سبب جذبہ مذہبی ہی ہوا ہی جو قرآنی تعلیم کی بدولت وجود میں آیا۔ اور اس مقدس جذبہ کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے تجربہ کی بنا پر بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہی کہ قرآن مجید سے بہتر کوئی دوسری کتاب نہیں ہو۔

مختصر کتاب اس سے زیادہ تفصیل کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ "اگر در خانہ کس است ہمیں یک حرف بس است" ورنہ بقول آسیر لکھنوی

کاغذ تمام کلک تمام اور ہم تمام
پر داستان شوق ابھی ناتمام ہی





تتمہ

ایک مخلص دوست نے اس کتاب کا پورا قلمی مسودہ ملاحظہ کرنے کے بعد فرمایا کہ قرآن مجید کی فصاحت وبلاغت اور اس کی تعلیم وہدایت کے بے نظیر اور معجز ہونے کی تو ان صفحات میں کافی وضاحت ہوگئی لیکن قرآن مجید کا یہ دعوے کہ اس کی ایک سورۃ کی مانند بھی کوئی دوسرا کلام پیش نہیں کیا جا سکتا ہو کسی قدر تشریح طلب ہی قرآن مجید کی بعض سورتیں نہایت مختصر اور صرف ایک ایک سطر کی ہیں۔ لہذا اس کلام الٰہی کا چیلنج (دعوی) دوسرے الفاظ میں یہ ہو کہ کوئی بشر اس کی ایک سطر کی مانند بھی دوسرا کلام پیش نہیں کرسکتا۔ چنانچہ بطور مثال (مشتے نمونہ از خروارے) سورہ العصر ملاحظہ ہو جو صرف تین آیتوں پر مشتمل ہو اور ایک سطر میں لکھی جا سکتی ہی۔

وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝ (یعنی زمانہ کی قسم کہ انسان یقیناً ٹوٹے میں ہی مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور اچھے کام کیئے۔ اور ایک دوسرے کو حق پر استقامت کی وصیت کرتے ہیں

اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرتے ہیں)

ارشاد ہوتا ہے کہ خود زمانہ اس کا شاہد ہے کہ وہ انسان ضرور نقصان اور خسارہ میں رہے گا جس نے اُن چار اصولوں پر عمل نہیں کیا جو اس سورۃ میں بیان کیے گئے ہیں۔

(۱) سب سے اوّل تو ایمان اور (۲) اُس کے ساتھ عمل صالح کی ضرورت ہے۔ بغیر عقیدہ کی مضبوطی اور پختہ ایمان کے کوئی بڑا کام انجام نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن صرف عقیدہ ہی کافی نہیں ہے بلکہ اُس کے مطابق احکام الٰہی پر عمل کرنا بھی نہایت ضروری اور لازمی ہے۔ انھیں احکام و ہدایات پر عمل کرنے سے ہر قسم کی دینی اور دنیاوی ترقیاں حاصل ہو چکی ہیں اور آئندہ ہو سکتی ہیں۔ لیکن باری تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ صرف یہ دو باتیں انسان کو نقصان اور خسارہ سے محفوظ نہیں رکھ سکتیں۔

ابتدائی دو اصولوں کی پیروی سے صرف انفرادی ترقی کی تکمیل تو ہو سکتی ہے۔ لیکن کامل ترقی کے لیے اجتماعی اور جمہوری ترقی بھی لازم ہے۔ لہذا حکم ہوتا ہے کہ انفرادی ترقی کے دونوں اصولوں پر عمل کر لینے کے بعد (۳) ایک دوسرے کو حق پر استقامت کی فہمایش اور تاکید کرنا بھی لازمی امر ہے۔ اور یہ تیسرا اصول ترقی ہے۔ اور یہ بھی کافی نہیں بلکہ اس کے بعد چونکہ حق پر قایم رہنے اور اُس کے مطابق عمل کرنے سے

بہت سی مخالفتوں کا مقابلہ ناگزیر ہوتا ہے لہذا ضروری ہے کہ چوتھے اصول پر بھی عمل کیا جاوے اور وہ یہ ہے کہ (۴) ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کی جاوے۔ صبر سے یہ مراد ہے کہ حق پر قایم رہنے کی وجہ سے جو جو مصائب پیش آئیں اُن کے مقابلہ میں ڈٹ جانا چاہیئے اور پیش آمدہ مخالفتوں اور تکلیفوں سے پریشان ہوکر حق کی حمایت نہ چھوڑنا چاہیئے۔

جب تک ان چاروں اصول پر عمل نہ ہوگا انسان ترقی نہیں سکتا چنانچہ مختص الوقت قومی اجتماع کانفرنسیں اور جلسے وقتاً فوقتاً اسی ضرورت سے منعقد کیئے جاتے ہیں۔ اور ہفتہ وارا ور سالانہ خطبوں اور مواعظ کا بھی یہی منشا ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ انفرادی اور اجتماعی ترقیوں کے تمام ضروری اور اہم اصول صرف ایک سطر میں قرآن مجید نے نہایت فصیح و بلیغ الفاظ میں بیان کردیئے۔

دُنیا کی تمام تاریخی کتابوں کی ورق گردانی کرجایئے۔ اور بنی نوع انسان کی ترقیوں کے اصول تلاش کیجیئے مگران چار اصولوں سے بڑھ چڑھ کر ہرگز کوئی نیا مشورہ نہ ملے گا۔ اگر دنیا بھر کی کتابیں جمع کی جائیں تو اس فصاحت و بلاغت کے ساتھ بیان کیئے ہوئے کامل ترقی حاصل کرنے کے یہ جامع اور مانع اصول اُن میں ڈھونڈے نہ ملیں گے۔ اور یہی قرآن مجید

کی تعلیم کا اعجاز ہے۔ اور اسی اعجاز کی بنا پر ساری دنیا کو چیلنج دیا گیا ہے کہ اگر ہو سکے تو قرآن مجید کی ایک چھوٹی سے چھوٹی سورۃ کی مانند ہی کوئی بشری کلام پیش کر دو۔

یہ ایک نہایت مختصر نمونہ ہے اُس پاک قرآنی تعلیم کا جو بنی نوع انسان کے لیئے ایسا مکمل قانون پیش کرتی ہے جس کی مدد سے انسان انتہائی روحانی اور مادّی ترقی کر سکتا ہے اور جس کی بدولت ایک خشک جزیرہ نما کے باشندے نہ صرف کامل خدا پرست اور روحانی پیشوا بن گئے بلکہ دنیا کی بڑی بڑی سلطنتوں کے مالک ہو کر اُنھوں نے علم و فضل کی روشنی تمام عالم میں پھیلا دی۔

نوٹ نمبر ۱۔ حق پر استقامت کے ساتھ صبر کی تلقین کا اس طرح وابستہ کیا جانا اس گہری حقیقت پر مبنی ہے کہ حق کی حمایت کرنے والوں کو شدید مخالفتوں سے ضرور مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ اور حقیقت میں یہی مقابلہ اور کشمکش حق پرستوں کی قوتوں میں ترقی اور اضافہ کا باعث ہوتا ہے۔ جس طرح کامیاب شہسوار وہی بن سکتا ہے جو شریر ترین گھوڑے پر قابو پا سکے۔ اسی طرح مخالفوں کی شدید مخالفتوں کا استقلال کے ساتھ مقابلہ کرنا ہی حقیقی کامیابی اور ترقی کا راستہ ہے۔ اور یہی صداقت شیطان

یا نفس امارہ یا قوائے بہیمیہ کے وجود کی مصلحت ظاہر کرتی ہے شیطانی طاقتوں سے مقابلہ کرنے اور اُن پر فتح پانے سے ایمانی قوتوں کو عروج اور ترقی نصیب ہوتی ہے۔ اگر کوئی مخالف قوت سامنے نہ ہو اور مقابلہ کی کبھی نوبت نہ آئے تو اپنی طاقت قایم رکھنے اور اُس کو بڑھانے کی کوئی ترغیب باقی نہیں رہتی۔ چنانچہ پہلوانوں کی کشتیوں کے دنگل اور کرکٹ ہاکی اور فٹ بال کے روزانہ میچ اسی حقیقت کی تصدیق کرتے ہیں۔

(۲) چونکہ مطبع میں اس کتاب کی کتابت ختم ہو چکی تھی اور بیچ میں اضافہ مضمون کی گنجایش نہ تھی اس لیئے اپنے دوست کے مشورہ کے مطابق اس مضمون کا تتمہ کے عنوان سے آخر میں اضافہ کیا گیا حقیقت میں یہ اضافہ چھٹے باب کا جزو ہے۔ جس میں قرآن مجید کی تعلیم و ہدایت کا ذکر ہوا ہے۔ اور اُس کے آخر میں چھپنا چاہیئے تھا۔

مولف

مطبوعہ نظامی پریس بدایوں

(محمد احید الدین ایف آر ایس اے پرنٹر)


REGISTERED
NIZAMI PRESS
BUDAUN